إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جنوری ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۷، شمارہ ۱ جنوری ۲۰۱۳ء/ ربیع الاوّل ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○ مقالۂ خصوصی

پاکستان میں اسلامی تبدیلی لانے میں سیاسی جماعتوں،
دینی تنظیموں اور اداروں کی ناکامی — اور متبادل لائحۂ عمل — مدیر — ۲

○ ربیع الاوّل کا پیغام

نعت ...... نوحۂ امت مسلمہ — حفیظ تائب — ۱۶

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کا جھوٹا دعویٰ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۷

○ پاکستانیات

جھوٹا آدمی، سچی بات — ۱۸

طالبان سے مذاکرات ضرور کیے جائیں — مدیر — ۱۹

○ علماء کرام سے معذرت کے ساتھ

ایک دردمند کی دعاء — علماء کرام کے لیے — پروفیسر ملک محمد حسین — ۲۱

○ تزکیۂ نفس

دعاء مانگنا سیکھیے (آخری قسط) — جناب احمد جاوید — ۲۴

○ تعلیم و تربیت

پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ میں تحقیق — جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی — ۳۰

اس ضمن میں چند اہم تجاویز — ڈاکٹر محمد امین — ۳۹

پنجاب میں تعلیم کی تباہی — ۴۰

○ اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی

سائنس کی مخالفت۔ ایک کارِ بے ثمر (آخری قسط) — محمد رشید — ۴۲

مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی قابل ردّ ہے — سید خالد جامعی — ۴۸

○ ملی مجلس شرعی کی قراردادیں — ۵۴

اہل تشیع کی ٹارگٹ کلنگ، قاضی حسین احمد کی وفات، میڈیا میں فحاشی
کے خلاف خط، جرمنی میں قادیونیوں کی کامیابی، جامعہ ازھر کا غلط فتویٰ

مقالۂ خصوصی　　مدیر

تبدیلی کیسے آ سکتی ہے؟

پاکستان میں سیاسی جماعتوں اور دینی تنظیموں و اداروں کی اسلامی تبدیلی لانے میں ناکامی...... اور متبادل لائحۂ عمل

تبدیلی سے کیا مراد ہے؟

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ تبدیلی سے کیا مراد ہے؟ چونکہ ہم مسلمان ہیں اور اللہ کو مانتے ہیں اور اللہ نے ہمارا مقصدِ زندگی طے کر دیا ہے جو اللہ کی عبادت کے ذریعے اس کی خوشنودی کا حصول ہے اور چونکہ پاکستان نہ صرف مسلم اکثریت کا ملک ہے بلکہ بنا ہی اس نظریے پر تھا کہ برصغیر کے مسلمان اسلامی عقیدے اور مخصوص تہذیب کی وجہ سے ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اور انہیں ایک الگ وطن درکار ہے جہاں وہ اپنے نظریات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لہٰذا پاکستانی ریاست کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق چلائے اور ذاتی زندگی میں انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل کے لیے مناسب ماحول مہیا کرے۔ گویا یہ طے ہے کہ ہمیں محض 'تبدیلی' کی نہیں بلکہ 'اسلامی تبدیلی' یا 'اسلامی تناظر میں تبدیلی' کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کی وضاحت کریں کہ 'اسلامی تناظر میں تبدیلی' سے ہماری کیا مراد ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ ذکر کر دیا جائے کہ محض 'تبدیلی' یا 'جزوی اسلامی تبدیلی' ہمیں کیوں درکار نہیں ہے اور ان سے ہمارے مسائل کیوں حل نہیں ہو سکتے؟

ہر تبدیلی کسی پیراڈائم پر مبنی ہوتی ہے

جو لوگ (خصوصاً سیاستدان) محض تبدیلی کا نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم کرپشن ختم کر دیں گے، تعلیم عام کر دیں گے، عوام کو روٹی کپڑا اور مکان مہیا کریں گے وغیرہ اور اسلام سے الرجک ہیں یعنی ان کا پروگرام اسلامی تناظر پر مبنی نہ ہو تو یہ محض تبدیلی کا نعرہ ہے، اسلامی تبدیلی کا نہیں اور وہ بھی محض نعرہ جیسا کہ ماضی میں بھٹو صاحب نے 'روٹی، کپڑا اور مکان' کا نعرہ لگایا لیکن عملاً وہ عوام کو روٹی کپڑا اور مکان نہ دے سکے بلکہ آج (2013ء میں) انہی کی جماعت کی حکومت نے عوام کو اِن بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم کر دیا ہے۔ تبدیلی کا یہ نعرہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ کوئی تبدیلی ہوا میں نہیں آتی بلکہ کسی نہ کسی فکری و تہذیبی پیراڈائم ہی میں لائی جا سکتی ہے اور اگر کسی رہنما کی سوچ اسلامی فکر پر مبنی نہ ہو تو دنیا میں اس وقت فکر و تہذیب کا دوسرا غالب پیراڈائم مغربی فکر و تہذیب کا ہے جو اپنی کنہ اور اساس میں غیر اسلامی ہے

اور جس کی اساسات ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، سائنسٹزم جیسے ملحدانہ نظریات ہیں جو توحید، رسالت اور آخرت کی نفی کرتے ہیں اور جن کے پیش نظر محض دنیا ہے اور وہ بھی خدا کی رہنمائی کے بغیر، صرف انسانی عقل و دانش پر انحصار کرتے ہوئے۔

ایسی کوئی تبدیلی مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی بلکہ صحیح تربات یہ ہے کہ اس طرح کوئی بڑی اور دیرپا تبدیلی مسلم معاشرے میں آ ہی نہیں سکتی اور وقتی طور پر آ بھی جائے تو جڑ نہیں پاسکتی، دیرپا اور ثمر آور نہیں ہوسکتی کیونکہ مغربی تہذیب کے پیراڈائم میں اسلامی اہداف و مقاصد کے لیے کام کرنا جمع بین الاضداد ہے جو ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فکری انتشار، اخلاقی تباہی اور ناکامی ہے جیسا کہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ مسلم ممالک کی اکثریت دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہوگئی تھی لیکن پون صدی گزرنے کے باوجود آج بھی ان کی اکثریت افلاس، جہالت اور ذلت و نکبت کے اندھیروں میں زندگی بسر کررہی ہے۔

'جزوی اسلامی تبدیلی' بھی قابل قبول نہیں

تبدیلی سے مراد فرد میں محض جزوی مذہبی تبدیلی بھی نہیں جیسا کہ ہمارے معاشرے میں یہ عام تصور ہے کہ جو آدمی داڑھی بڑھالے، نماز پڑھنے لگے اور شلوار قمیض پہننے لگے تو اسے 'مذہبی آدمی' سمجھا جانے لگتا ہے خواہ زندگی کے باقی سارے شعبوں میں اس کے کرتوت منافقوں اور کافروں جیسے ہوں۔ اور نہ ریاستی سطح پر اسلامی تبدیلی کا یہ مطلب ہے کہ احترام نماز و رمضان اور نفاذ حدود شرعیہ کے قوانین بنادیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ شریعت نافذ ہوگئی ہے خواہ ان پر عمل ہو یا نہ ہو خواہ ملک تعلیم میں پیچھے ہو اور تعلیم مغربی تہذیب کے مطابق ہو، لوگ بھوک سے خودکشیاں کررہے ہوں اور ملک یورپ و امریکہ کا غلام ہو اور رشوت، کرپشن، چوری، ڈاکے، فحاشی اور زنا وغیرہ سکہ رائج الوقت ہوں۔ اسی طرح کا بعض شعبدہ بازوں کا یہ بیان ہے کہ اگر ہمیں اقتدار مل جائے تو ہم چوبیس گھنٹے میں شریعت نافذ کردیں گے۔ گویا شریعت کوئی بجلی سے چلنے والی آٹومیٹک مشین ہے جس کا وہ بٹن دبادیں گے اور وہ پروڈکشن دینا شروع کردے گی۔

'تبدیلی' کے مندرجہ بالا تصورات تبدیلی کے جزوی اور ناقص تصور ہیں اور زیادہ تر مغربی فکر و تہذیب (خصوصاً سیکولرزم) سے متاثر اور اس پر مبنی ہیں۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ تبدیلی کا صحیح تصور کیا ہے؟

تبدیلی کا صحیح تصور

تبدیلی کا صحیح اسلامی تصور ایک جامع تصور ہے جس کا مطلب فرد کی تبدیلی بھی ہے اور

معاشرے وریاست کی تبدیلی بھی اور یہ ایک ہمہ گیر تبدیلی ہے جس کا ہدف انسان کی دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی ہے۔جس کے پیش نظر فرد میں ایسی ہمہ گیر تبدیلی لانا ہے؛عبادات میں، اخلاق میں اور سارے دنیاوی معاملات میں جس کی اساس اسلامی فکر،عقیدہ اور ورلڈ ویو ہو۔اور ریاست کی ضرورت و اہمیت اور کردار یہ ہے کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کے اجتماعی امور(مثلاً نظام معیشت،سیاست،قانون،تعلیم وغیرہ) کو اسلامی تقاضوں کے مطابق چلائے بلکہ دینی احکام کے مطابق فرد کی تعلیم وتربیت، ذہن سازی اور تطہیر افکار اور تعمیر سیرت بھی کرے اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے میں اس کی اعانت بھی کرے اور ریاستی قوت سے ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرے کہ افراد معاشرہ اسلام کی ہمہ جہت تعلیمات پر برضا و رغبت عمل کریں اور دنیاوآخرت کی حسنات سمیٹ سکنے کے قابل ہوسکیں۔

اس طرح کے جامع تغیر کا منبع فرد کی تبدیلی ہے کیونکہ اسلام کی رو سے فرد ہی اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے نہ کہ معاشرہ وریاست،اور قوم وتہذیب۔اور ویسے بھی معاشرے اور ریاست کی بنیادی اکائی فرد ہی ہوتا ہے لہٰذا معاشرے اور ریاست میں کوئی بنیادی تبدیلی اس وقت تک نہیں آسکتی اور نہیں لائی جاسکتی جب تک فرد میں وہ تبدیلی نہ آئے۔فرد میں یہ تبدیلی جزوی نہیں ہونی چاہیے اور اگر اللہ اور آخرت کا صحیح تصور کسی مسلمان میں راسخ ہوتو یہ تبدیلی جزوی ہو بھی نہیں سکتی۔یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی اللہ سے ڈرتا ہوتو وہ مسجد میں تو اللہ کے آگے جھکے لیکن دکان پہ جا کر اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے اور کم تولے۔یا خودتو وہ پیٹ بھر کر کھائے لیکن اس کا ہمسایہ بھوکا سوئے۔مطلب یہ کہ فرد میں یہ تبدیلی زندگی کے ہر پہلو میں آنی چاہیے، سیاست میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، تعلیم میں......اور فرد میں جب یہ تبدیلی آجائے گی تو افراد معاشرہ مل کر جو ریاست بنائیں گے وہ بھی ظاہر ہے انہی اسلامی اصولوں پر عمل کرے گی اور دین پر چلنے میں افراد معاشرہ کی مدد کرے گی اور جو کام اجتماعی قوت سے ہونے والے ہیں جیسے نفاذ حدود، جہاد، قیام امن وامان وغیرہ ان پر بھی عمل پیرا ہوگی۔

اہمیت

فرد اور معاشرے وریاست میں مذکورہ اسلامی تبدیلی آنے اور نہ آسکنے میں دراصل مسلمانوں کے عروج وزوال کا راز پوشیدہ ہے۔نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب میں جو تبدیلی لائے اور آپ ﷺ نے جو افراد تیار کیے اور انہوں نے جو ریاست قائم کی اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ پندرہ سال سے کم عرصہ میں دو سپر پاورز اس کے قدموں میں تھیں حالانکہ اس نے کوئی ایٹم بم نہیں چلایا تھا بلکہ مسلمان کی قوت درحقیقت ایمانی اور اخلاقی تھی جس کا اظہار زندگی کے سارے شعبوں میں ہوا۔جب تک اس ایمانی و اخلاقی تبدیلی کا اثر رہا مسلمان دنیا پر غالب رہے اور جب وہ اس سے محروم ہوگئے تو غیروں کے غلام ہوگئے

اور ذلت ونکبت نے انہیں آ گھیرا۔ لہٰذا مسلمان اگر اپنی عظمت گم گشتہ کو واپس لوٹانے کے خواہاں ہیں تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ نبوی طرز پر فرد کی ہمہ گیر تربیت کی جائے اور ایسا معاشرہ اور ریاست بھی وجود میں لائی جائے جو اسلامی اصولوں پر عمل کرے۔

اور دنیاوی عروج و زوال سے بھی جو چیز ایک مسلمان کے لیے اہم تر ہے وہ ہے آخرت کی کامیابی۔ دنیا کی زندگی میں ایک مسلم فرد اگر بظاہر ناکام اور بے بس بھی ہو لیکن صحیح نیت کے ساتھ مقدور بھر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے گزارنے کی کوشش کرے تو اسلام کی رو سے وہ کامیاب ہے کیونکہ وہ (ان شاء اللہ) آخرت میں بھی کامیاب ہوگا۔ اور اگر آدمی کو دنیا کا سارا مال ومتاع اور اولاد، بنک بیلنس، گاڑی، بنگلہ اور جاہ ومنصب سب کچھ میسر ہو لیکن یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی سے حاصل ہو اور آخرت میں اس کی ناکامی پر منتج ہو تو یہ دراصل بڑی ناکامی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے مطابق بدلنے کی بجائے ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچے جو مغربی تہذیب اور سیکولرزم، کیپٹل ازم وغیرہ پر مبنی ہو۔

مطلوبہ تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے؟

مذکورہ انفرادی اور اجتماعی تبدیلی کیسے آسکتی ہے یا کیسے لائی جاسکتی ہے؟ اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر کے یعنی جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کی تربیت کر کے انہیں بدلا اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ خلفاء راشدین نے اسلامی ریاست قائم کی اور چلائی، اس کی اتباع کر کے آج بھی فرد اور ریاست کو بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مختصر اصولی جواب سے ممکن ہے بعض اذہان کی تشفی نہ ہو۔ دوسرے اسوۂ نبوی سے استنباط اور اخذ واستفادہ کرتے ہوئے لوگوں نے دعوت واصلاح اور تبدیلی کے متعدد طریقے دریافت اور وضع کر لیے ہیں، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو مزید وضاحت سے بیان کریں۔

سہولت بیان کی خاطر کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تناظر میں تبدیلی لانے کے دو بڑے منہاج ہیں: ایک معاشرتی یا غیر سیاسی منہاج جس سے 'سماجی تبدیلی' (Social Change) وقوع پذیر ہوتی ہے اور دوسرے سیاسی منہاج جس میں ریاستی قوت سے فرد اور معاشرے میں تبدیلی لانے کی سعی کی جاتی ہے۔ اسے اختصار سے 'سیاسی تبدیلی' بھی کہا جاسکتا ہے۔ اب ہم تبدیلی لانے کے ان دونوں طریقوں پر کچھ روشنی ڈالیں گے:

اسلامی تغیر بذریعہ سماجی تبدیلی (Social Change)

قرآن وسنت میں اس کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور مسلم روایت میں اسے دعوت واصلاح بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے دو اجزاء ہیں: ایک ذہن سازی اور دوسرے عملی اقدامات۔ ذہن سازی کے کام کو وعظ وتبلیغ اور دعوت کا نام بھی دیا جاتا ہے اور عملی اقدامات کو اصلاح، تزکیہ و تربیت وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی توسیعی صورت خدمت خلق ہے۔ مسلم روایت میں پہلی صورت کے لیے رسمی اور غیر رسمی تعلیم سے کام لیا گیا یعنی مدارس قائم کیے گئے، مساجد کو وعظ وتبلیغ کے لیے استعمال کیا گیا اور ابلاغ کے لیے شعر وادب اور تحریر سے کام لیا گیا۔ تزکیہ وتربیت کے لیے تصوف اور خانقاہیں وجود میں آئیں اور خدمت خلق کا کام بھی صوفیاء نے کیا۔ ریاستی قوت نے بھی ان کاموں میں عموماً علماء وصلحاء سے تعاون کیا اور اگر نہ بھی کیا تو علماء وصلحاء اس کام کو مسلم معاشرے کے تعاون سے کرتے رہے۔

عصر حاضر میں ذہن سازی کے ان وسائل کی کیفیت کیا ہے؟ اس کی صحیح تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ہم عصر حاضر کے مسلم مائنڈ سیٹ (Mind set) کو سمجھنے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ آج مسلم فکر کسی مرحلے میں ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اپنے نظریۂ حیات سے عدم وابستگی کی وجہ سے ان کے اندر ایمانی واخلاقی کمزوری آگئی اور ان کی وہ صلاحیتیں ماند پڑ گئیں جو دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی حریف مغربی تہذیب نے جو یورپ وامریکہ میں قوت پکڑ چکی تھی، مسلم علاقوں کو فتح کر کے انہیں غلام بنالیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اگرچہ انہیں کچھ سیاسی آزادی مسلم ممالک کو دینا پڑی لیکن انہوں نے اب پُرامن تبدیلی کے ذریعے اپنے استعماری مقاصد کو جاری رکھنے کی حکمت عملی اپنالی۔ چنانچہ مغربی قوتوں کی حکمت عملی سے مسلم معاشرے میں مغرب کی فکری وذہنی غلامی اب بھی جاری ہے۔ مسلم ممالک کی تعلیم اور میڈیا ان کے زیر اثر ہے، مسلم مالیات ان کے کنٹرول میں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم سیاسی وانتظامی قیادت (یعنی سیاستدان وفوجی حکمران اور سول وملٹری بیوروکریسی) کو وہ اپنی حکمت عملی سے اپنی مٹھی میں لیے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود مسلم معاشرے میں احیائے اسلام اور سیاسی اقتدار کو مخلص مسلمانوں کے ہاتھ میں لانے کی جدوجہد بھی جاری ہے لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک میں مغرب زدہ طبقہ حکمران ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل کے حوالے سے اِس کے اور عام مسلمانوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔

ان حالات میں عام یا جدید تعلیم کا نظام مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر پاکستان میں جاری وساری ہے جو نسل نو کو غیر مسلم بنا رہا ہے اور علماء کرام اور دینی عناصر اس کی اصلاح کے لیے کوئی مؤثر جدوجہد نہیں

کر رہے۔علماء کرام اس کے برعکس اُس جزوی یا وقتی نظام تعلیم کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو انگریزوں کے مسلم ہندوستان کے نظام تعلیم کے انہدام کے بعد علماء نے دفع الوقتی کے طور پر اپنایا تھا کہ مسلم معاشرے کی مساجد اور معاشرتی رسوم ورواج کے لیے علماء پیدا کرتے رہیں۔جب کہ قیام پاکستان کے بعد اس کے تسلسل کا کوئی جواز باقی نہیں رہا اور اب انہیں ایسے افراد تیار کرنے چاہئیں جو مسلم معاشرے اور ریاست کے چلانے میں بھی ممد ثابت ہوسکیں،جس منہج پر کہ بارہ سو سال تک مسلم مدارس کام کرتے رہے ہیں یعنی نظام تعلیم کی وحدت کی بنیاد پر نہ کہ ثنویت اور سیکولرزم کو اپناتے ہوئے کیونکہ اسلام میں دنیا و دین اور دنیا و آخرت کی تفریق کا کوئی تصور موجود ہی نہیں۔اسلام کے مطابق تربیت وتزکیہ (اپنے وسیع تر مفہوم میں) نہ جدید تعلیم میں ہے اور نہ مدرسے کی تعلیم میں۔بڑوں (grown ups) کے لیے تربیت وتزکیہ کا جو نظام تصوف نے خانقاہوں میں پروان چڑھایا تھا اسے بھی غیر اسلامی رسوم ورواج کی دراندازی اور وقت کی گرد نے مضمحل کر دیا اور اب چند ایک خانقاہوں کے سوا جہاں کچھ اچھا کام ہو رہا ہے (اور وہ بھی جزوی طور پر) اکثر خانقاہیں اور مزارات دنیاوی سیادت و سیاست اور مال بنانے کے اڈے بن چکے ہیں جہاں ایمان واخلاق اور روحانیت سرے سے موجود ہی نہیں۔غیر رسمی تعلیم میں میڈیا جس طرح فحاشی و عریانی اور رقص وسرود پھیلا رہا ہے اس کا مشاہدہ عام ہے اور علماء کرام، دینی جماعتیں اور ادارے اس کی مذمت ومزاحمت اور متبادل اچھے پروگراموں کی تیاری کے لیے کچھ نہیں کر رہے۔خدمت خلق کی طرف بھی علماء وصلحاء کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔

جہاں تک اسلامی ذہن سازی اور تعمیر کردار میں پاکستانی حکومتوں کا تعلق ہے وہ نہ صرف یہ کہ ان شعبوں میں اصلاح کے لیے کچھ نہیں کر رہیں بلکہ الٹا مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر ریاستی وسائل سے فساد اور بگاڑ پیدا کر رہی ہیں۔ان حالات میں علماء کرام، دینی جماعتوں، اداروں اور سول سوسائٹی کے دین دار افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنے موجودہ خول سے باہر نکل کر سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد کا راستہ اپنائیں بلکہ اس کے لیے اصلاح وخدمت کی ایک زوردار تحریک چلائیں۔جو لوگ اس کام کی طرف آنا چاہیں ہم ان کی خرد افروزی کے لیے چند تجاویز ان کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں کہ عصر حاضر میں اس کام کو کس طرح منظم انداز میں کیا جا سکتا ہے:

1۔ فرد کی تعمیری اور متوازن ذہن سازی کے لیے تین شعبوں میں کام کیا جائے:

ا۔ **تعلیم کو عام کرنا:** وحدت تعلیم، اسلامی تناظر کے احیاء اور مغربی تہذیب کی عدم پیروی کے اصولوں پر جدید تعلیم کی تشکیلِ نو اور وحدت تعلیم کے تصور پر دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کرنے کے بعد۔

۲۔ **تربیت اور کردار سازی:** نسل نو کی تربیت تعلیمی اداروں میں اور بڑوں (grown ups)

کے لیے خصوصی تربیتی مراکز میں۔

۳۔ میڈیا: اسلامی تناظر میں میڈیا کی تعلیم اور پروگراموں کی تیاری کے ذریعے اور میڈیا میں مغربی تہذیب کے اثرات کی مذمت اور مزاحمت کرتے ہوئے۔

2۔ خدمت خلق کے بھی تین شعبوں میں کام کیا جائے:

۱۔ افلاس میں کمی: مسجد میں قائم کمیٹی کے ذریعے جو محلے کے مال دار افراد کی مالی معاونت سے محلے کے یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی مدد کرے۔ غریبوں کے علاقے میں سستے تنور کھولے جائیں جہاں غریبوں کو روٹی اور دال سبزی برائے نام قیمت پر میسر ہو۔ اسی طرح امراء سے زائد از ضرورت کپڑے جمع کرکے غریبوں کے لیے سٹوروں میں انہیں معمولی قیمت پر مہیا کیا جائے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں مرکزی زکوٰۃ کونسل قائم کرکے اس میں قوم کے قابل اعتماد اور نیک افراد جمع کرکے زکوٰۃ وعشر جمع کیا جائے اور منصفانہ بنیادوں پر اسے غریبوں میں تقسیم کیا جائے۔

۲۔ امن وامان کی بحالی: ہر محلے کی مسجد میں امن کمیٹی بنا کر اور گلی کے نوجوانوں کے ذریعے پہرہ داری نظام قائم کرکے۔

۳۔ عدل وانصاف کی فراہمی: ہر گاؤں، قصبے اور شہروں میں وارڈ یا محلے کی بنیاد پر شرعی یا مصالحتی عدالت کے قیام کے ذریعے۔ اس عدالت کا مرکز محلے کی مسجد ہو اور اس میں امام/خطیب کے علاوہ علاقے کے دو معزز نمازی افراد شامل ہوں (جیسے نیک نام وکیل، ریٹائرڈ جج، پروفیسر یا سرکاری ملازم وغیرہ)۔

ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ فرد کی اسلامی تناظر میں ذہن سازی (بذریعہ تعلیم وتربیت ومیڈیا، بعد از اصلاح) اور خدمت خلق کے یہ کام بغیر حکومتی مدد کے پرائیویٹ سیکٹر میں منظم کیے جاسکتے ہیں۔ ان سے نہ کسی آئین وقانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے، نہ حکومت کی رِٹ پر کوئی حرف آتا ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ معاشرے (سول سوسائٹی) کے دردمند اور دین دار افراد اور علماء وسیاست دانوں میں سے جن کو ان کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے وہ متحرک ہوجائیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ اس کے لیے لنگر لنگوٹ کس کر اور منظم ہوکر میدان میں اتریں تو چند برسوں میں، ان شاء اللہ، اس تحریک کے مفید اور تعمیری ثمرات سامنے آنے لگیں گے۔

تبدیلی کا سیاسی منہاج (سیاسی تبدیلی)

اس کا مطلب یہ ہے کہ برسر اقتدار آکر ریاستی قوت سے اسلامی تبدیلی کے لیے کام کیا جائے۔ مسلم معاشرے میں برسر اقتدار آنے کے چار ممکنہ ذرائع ہیں: ۱۔ سیاسی جماعتیں ۲۔ دینی سیاسی

جماعتیں ۳۔ پُرامن اسلامی انقلاب بذریعہ عوامی قوت ۴۔ جہاد۔ اب ہم ان پر کچھ روشنی ڈالیں گے:

۱۔ سیاسی جماعتیں

سیاسی جماعتیں مغربی جمہوریت کی پیداوار ہیں اور مغربی جمہوریت مغرب کے اس ورلڈ ویو کی پیداوار ہے جس کی فکری اساسات ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم وغیرہ ہیں جو اپنی کنہ میں اسلام مخالف ہیں کیونکہ اس ورلڈ ویو کی رو سے انسان خودمختار، بلکہ مختار مطلق ہے۔ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے اور اسے معاشرے اور ریاست کے اجتماعی نظام میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ انسانی تگ و دو کا محور صرف دنیا کی زندگی ہے اور علم صرف وہ ہے جو عقل اور مشاہدہ و تجربہ کا نتیجہ ہو۔ اس نظام فکر میں جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ فرد چونکہ مختار مطلق ہے لہٰذا مجموعہ افراد یا عوام کے نمائندوں کو حکومت چلانے کا حق حاصل ہے اور فرد چونکہ مختار مطلق ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی مختار مطلق ہیں اور حلال وحرام اور حق و باطل کا تعین کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کئی مغربی حکومتوں نے شراب، جوئے، زنا، لواطت وغیرہ کو حلال قرار دے دیا ہے۔ امریکہ ویورپ نے اپنی فکر وتہذیب کو دنیا میں پھیلانے خصوصاً مسلم ممالک پر اپنا سیاسی وتہذیبی غلبہ مستحکم کرنے کے لیے جمہوریت کو تقدس کا لبادہ پہنا دیا ہے اور اسے ایک عالم گیر سچائی قرار دے دیا ہے۔ مسلم ممالک میں حکمران طبقے چونکہ مغرب زدہ بلکہ مغرب پرست ہیں اور اقتدار میں آنے کے لیے مغرب کی حمایت کے متلاشی رہتے ہیں لہٰذا وہ بھی جمہوریت کے گن گاتے ہیں اور اس کے علمبردار ہیں اور مغربی طرز کی سیاسی جماعتیں بنا کر انتخاب لڑتے اور امریکہ ویورپ کی مدد سے اقتدار میں آتے ہیں اور انہی کی پالیسیاں چلاتے ہیں۔

اس پس منظر میں وہ مسلم معاشرے میں کم سے کم تبدیلی چاہتے ہیں اور اسلامی تبدیلی تو بالکل نہیں چاہتے لہٰذا وہ اس طرح کی جمہوریت چاہتے اور چلاتے ہیں جس میں حقیقی رائے عامہ کبھی اوپر نہ آ سکے، دینی عناصر کو کبھی اقتدار نہ ملے اور خود انہیں کرپشن اور مال حرام بنانے کی کھلی آزادی ملی رہے۔ عوام، عوامی مفاد اور اسلام کا نام البتہ وہ بہت لیتے ہیں اور ان چیزوں کو کوَر (Cover) کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ عوام اور دینی عناصر کے دباؤ پر اسلامی قوانین بھی بنا لیتے ہیں لیکن کبھی ان پر عمل نہیں کرتے۔ اسلامی تبدیلی کے چونکہ وہ دل سے خواہاں نہیں ہوتے لہٰذا سیاسی عزم (Political Will) کی کمی کی وجہ سے معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے۔ عوام کو بہلانے اور اقتدار میں آنے کے لیے یہ سیاسی جماعتیں انصاف اور احتساب کا نعرہ بھی لگاتی ہیں اور کرپشن، ظلم اور ناانصافی کی مذمت بھی کرتی ہیں لیکن یہ کام اسلامی تناظر میں کرنے کے قریب نہیں پھٹکتیں کیونکہ اگر کوئی حقیقی اسلامی تبدیلی چاہے تو امریکہ ویورپ اس کی مخالفت کریں گے اور اسے اقتدار میں نہیں آنے دیں گے لہٰذا وہ جمہوری نظام کے

اندر اور مغربی تصورات کے قریب رہتے ہوئے انصاف، احتساب اور گڈ گورننس کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تناظر میں فرد، ریاست اور معاشرے میں تبدیلی لانا نہ ہماری سیاسی جماعتوں کا ایجنڈا ہے، نہ ان کے اندر اس کام کی صلاحیت اور عزم ہے لہٰذا ان سے اس کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔

۲۔ دینی سیاسی جماعتیں

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں ملک میں اسلامی تبدیلی لانے میں ناکام ہو چکی ہیں اور اگر وہ اپنی سوچ اور طریق کار کو نہیں بدلتیں تو مستقبل میں بھی ان کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس المیے کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہر دینی مسلک نے ایک سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے اور ہر مسلک کا علمبردار صرف اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے بلکہ اپنے مسلک ہی کو عین دین سمجھتا ہے لہٰذا ان دینی سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی بامعنی اور حقیقی اتحاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس مشکل کا سادہ، سیدھا اور واضح حل یہ ہے کہ ہر مسلک اپنے آپ کو ایک اجتہادی مکتبۂ فکر سمجھے، دوسرے مسالک کے صحیح ہونے کے امکان کو تسلیم کرے اور پاکستان میں ریاستی قوت کو اسلامی تبدیلی لانے کے ایک کم از کم پروگرام پر سب مسالک اور دینی عناصر متحد ہو جائیں اور ذاتی و مسلکی ایجنڈے سے صرف نظر کریں تو وہ ان شاء اللہ بہت جلد انتخابی قوت بن جائیں گے اور ان کے کامیاب ہو کر حکومت بنانے کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔

۲۔ اگر اللہ تعالیٰ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو اخلاص اور فراست عطا فرمائیں تو سطور بالا میں کہی گئی بات کے علاوہ انہیں یہ بات بھی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ ان کے درمیان اختلافات اور انتشار کو ہوا دینے میں اسلام دشمن بین الاقوامی طاقتوں اور ان کے خفیہ اداروں کا کردار بنیادی ہے اور وہ اپنے ایجنٹ مسلم حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کو بھی اس غرض سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ ان حکمرانوں کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دینی جماعتیں آپس میں لڑتی رہیں تاکہ مقابلتاً وہ آسانی سے انتخابات جیت جائیں اور دینی جماعتوں سے ان کی جان چھوٹی رہے۔

۳۔ بین الاقوامی طاقتوں اور ان کے مقامی گماشتوں نے مل کر پاکستان میں ایسے حالات پیدا کر رکھے ہیں کہ اسلامی تبدیلی کی علمبردار کوئی جماعت یہاں انتخابات میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی مثلاً یہاں تعلیم عام نہیں ہونے دی گئی۔ غربت ایمان کش حد تک بڑھ گئی ہے۔ معاشرے میں جاگیردارانہ نظام کو باقی رکھا گیا ہے۔ برادری ازم، علاقائی اور لسانی تعصّبات کو حکومتوں کی طرف سے ابھارا جاتا ہے۔ انتخابات میں حصہ لینے کو اتنا مہنگا بنا دیا گیا ہے کہ عام آدمی اس میں حصہ لینے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ سرمایہ دار سیاستدان انتخابات میں کروڑوں خرچ کر کے کامیاب ہوتے ہیں اور جیت کر اربوں روپے رشوت،

چوری، فراڈ، کمشن، کرپشن اور کِک بیکس (Kickbacks) وغیرہ کے ذریعے کمانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دستور کی ان دفعات پر کوئی عمل نہیں کرتا جو امیدوار پر اخلاقی قدغنیں عاید کرتی ہیں۔ انتخابی طریق کار ایسا ہے کہ اس میں 20 فی صد ووٹ لینے والا بھی کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے اور ملک بھر میں نمائندگی رکھنے والی جماعت کے ووٹ بیکار جاتے ہیں اگر وہ حلقوں میں اکثریت نہیں دکھا سکتی۔ اس کا حل یہ ہے کہ مؤثر انتخابی اصلاحات کی جائیں اور ان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں اور طرزِ انتخاب جداگانہ ہو۔

۴۔ ان حالات میں کہ بین الاقوامی طاقتیں اور ملک کے حکمران اور سیاسی جماعتیں 'دینی سیاسی جماعتوں' کے خلاف ہیں اور انہیں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتیں، ان کی کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ عوام کی بھرپور حمایت حاصل کریں۔ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سطور بالا میں ذکر کردہ سماجی تبدیلی کے منہاج کو اپناتے ہوئے عوام کی ذہن سازی کریں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ کیونکہ عوام علماء کرام اور دینی رہنماؤں کی عزت و احترام تو کرتے ہیں لیکن ابھی انہیں یہ یقین نہیں ہے کہ علماء اور دینی لوگ ان کے دنیوی اور سیاسی، معاشی، قانونی اور تعلیمی مسائل حل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہیں بتانے کی ضرورت نہیں عملاً کر کے دکھانے کی ضرورت ہے اور ان کے مسائل حل کرنے میں آج ان کی معاونت کی ضرورت ہے تاکہ انہیں یقین آجائے کہ علماء اور دینی عناصر اگر کل اقتدار میں آ گئے تو ان کے مسائل حل کر سکیں گے۔

۶۔ دینی سیاسی جماعتوں کی انتخابات میں کامیابی کی ایک اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ ان موانع کو دور کرنے کی کوشش کریں جن کا ذکر اوپر نمبر ۳ میں ہوا ہے اور جن کو دور کیے بغیر انتخابات کے ذریعے حقیقی رائے عامہ اوپر آ ہی نہیں سکتی اور نہ متوسط طبقے کی دینی سیاسی جماعتیں انتخابات جیت سکتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں دوسری قدرے معقول سیاسی جماعتوں کی تائید بھی حاصل کرنی چاہیے۔

۳۔ عوامی حمایت سے پُرامن انقلاب برپا کرنا

بعض دینی عناصر یہ دیکھ کر، کہ مغربی جمہوریت خلاف اسلام ہے، انتخابی نظام کرپٹ ہے، اس کے ذریعے کامیابی ممکن نہیں اور کارکنوں کا اخلاق بھی اس سے خراب ہوتا ہے، چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی انقلاب لانے کے لیے پُرامن طریقے سے عوامی قوت اور سٹریٹ پاور کو متحرک کیا جائے۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قائم کردہ تنظیم اسلامی اسی کی قائل ہے۔ اسے وہ خلافت کا نظام بھی کہتے ہیں اور منہج انقلاب نبوی کی واحد صحیح تعبیر بھی۔ حال ہی میں عرب ممالک میں، مغربی حمایت سے طویل برسوں سے قائم آمرانہ نظام کو عوامی قوت سے کامیابی سے منہدم کیا گیا ہے لیکن یہ صرف اس لیے ممکن ہوا کہ اس

کے پیچھے منظم سیاسی دینی قوتیں موجود تھیں۔ ایران میں اسلامی انقلاب بھی اسی طرح سٹریٹ پاور اور عوامی مزاحمت سے آیا تھا لیکن اس طرح کی کوئی تحریک اسی وقت ثمر آور ہوسکتی ہے جب اسے سنبھالنے کے لیے منظم سیاسی قوت موجود ہو۔ پاکستان میں ہمارے دیکھتے دو دفعہ عوام متحرک ہوئے، سڑکیں لوگوں سے بھر گئیں، عوام نے پولیس کو ناکام کر دیا اور فوج سے بھی گولیاں کھائیں لیکن دونوں دفعہ ایوب خان اور بھٹو تو اقتدار سے گئے لیکن ان کی جگہ لینے اور متبادل نظام دینے کے لیے چونکہ تحریک چلانے والوں میں اتفاق رائے اور ہم آہنگی موجود نہ تھی اس لیے دونوں دفعہ ایسا متبادل نظام نہ آسکا جو عوام کی اُمنگوں پر پورا اترتا اور ان کے مسائل ومشکلات دور کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اِس وقت عوام بدترین حالات کے باوجود بے حِس ہیں اور کسی عوامی تبدیلی کے آثار نہیں ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اس وقت (جنوری ۲۰۱۳ء میں) پاکستان میں ایسے حالات اور ایسی منظم سیاسی قوتیں موجود ہیں جو سٹریٹ پاور سے اسلامی انقلاب لائیں اور موجودہ نظام سے عوام کو چھٹکارا دلا کر اسلامی اصولوں پر مبنی متبادل نظام لائیں اور اسے سنبھال کر ثمر آور کر سکیں۔

۴۔ جہاد/خروج

اسلام میں جہاد کا تصور بڑا وسیع ہے مثلاً نفس کے خلاف مجاہدہ کہ وہ احکام شریعت پر عمل کا خوگر ہوجائے نیز زبان، قلم اور مال سے اشاعت اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کی کاوشیں بھی جہاد شمار ہوتی ہیں۔ تاہم جہاد بمعنی قتال اور مسلح جدوجہد کی دو معروف صورتیں ہیں۔ **ایک:** اگر کفار مسلم ملک پر حملہ آور ہوں تو ان کی مسلح مزاحمت اور مدافعت اور انہیں مسلمان ملک سے نکال باہر کرنے کی کوشش دفاعی جہاد (Defensive Jihad) ہے۔ **دوسرے:** اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے عوام کو تفہیم اسلام کے مواقع دینے پر تیار نہ ہو اور قوت سے اسلام کی مزاحمت کرے تو ایسے حکمرانوں کی سرکشی توڑنے کے لیے مسلح جدوجہد اقدامی جہاد (Offensive Jihad) کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک تیسری صورت خروج کی بھی ممکن ہے اور وہ ہے غیر صالح مسلمانوں کی حکومت کو قوت سے ختم کر کے اس کی جگہ صالح لوگوں کی حکومت لانا۔ ایسی کسی کوشش کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو شرطیں مقرر فرمائی ہیں: **ایک یہ** کہ حکمران بنیادی دینی فرائض کے بھی تارک ہوجائیں جیسے اقامت صلوۃ کا ترک اور دوسرے کسی صریح اور منصوص دینی حکم کی علی الاعلان مخالفت کریں جیسے کوئی مسلم حکمران اعلان کرے کہ وہ زکوۃ نہیں لے گا یا لوگوں کو حج پر نہیں جانے دے گا۔ اور اِس صورت میں بھی مسلح مزاحمت کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے وجوب نہیں کیونکہ ایسی صورت میں بھی مسلمانوں کو اھون البلیتین پر عمل کا حکم ہے یعنی جس صورت میں نقصان کم سے کم ہو اسے اختیار کیا جائے گا کیونکہ بسا اوقات ایک بُرائی کو ختم کرنے کی کوشش میں اس

سے بڑی بُرائی اور بڑا فساد برپا ہوجاتا ہے ایسی صورت میں اس چھوٹی بُرائی کو برداشت کرلینا مناسب ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی المناک شہادت سے امت کو جس شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا اس کے بعد اہل سنت کے ہاں ایک تیسری شرط پر اجماع ہوگیا اور وہ یہ کہ حکومت کو الٹنے کی کوئی کوشش اسی وقت جائز ہے جب اس کی کامیابی کے واضح امکانات موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صدر اوّل کے بعد جب تک بری بھلی خلافت قائم رہی امت کے جلیل القدر آئمہ اور علماء نے کم درجے کے لوگوں کو ہٹا کر صالح لوگوں کو برسر اقتدار لانے کے لیے کبھی کسی مسلم حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کی۔ عصر حاضر میں افغانستان میں ایسے جہاد کی کامیابی کے بعد جس طرح مجاہدین نے آپس میں کشت وخون کیا اور اتنی بڑی فتح کے بعد بھی افغانستان میں اسلامی نظام نہ آسکا، اُس نے اِس مؤقف کو مزید پختہ کیا ہے کہ جب تک کامیابی اور متبادل بہتر اسلامی نظام قائم کرنے کی صلاحیت کے واضح امکانات موجود نہ ہوں، اس کام کو جہاد سمجھ کر اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک آج نہ تو پاکستان میں ایسے حالات ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف خروج اور بغاوت کی جائے اور نہ ایسی کسی کوشش کے کامیاب ہونے کے امکانات موجود ہیں کیونکہ:

۱۔ دینی عناصر نے پاکستان میں پُرامن دعوت واصلاح اور سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اس کی بہت زیادہ گنجائش ابھی تک موجود ہے لہٰذا اتمام حجت کیے بغیر اور محنت کا حق ادا کیے بغیر پُرامن تبدیلی سے مایوس ہوکر ہتھیار اٹھالینا خلاف عقل ومنطق اور خلاف شریعت ہے۔

۲۔ پاکستان کے آئین میں شرعی لحاظ سے مطلوب اکثر چیزیں موجود ہیں مثلاً یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، مملکت کا مذہب اسلام ہوگا، خلاف اسلام کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ حکومت لوگوں کو اسلام پر عمل کرنے میں مدد دے گی۔ نفاذِ حدود، احترام نماز وروزہ، انتظامات حج، زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی وغیرہ کے قوانین موجود ہیں۔ شراب، جوا، زنا، فحاشی، کرپشن وغیرہ ختم کرنا ریاست کی آئینی ذمہ داری ہے۔ غرض دستور پاکستان میں اسلامی دفعات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر کوئی اسلام پسند حکومت آجائے تو وہ پورا اسلام بآسانی نافذ کرسکتی ہے۔ کمی صرف حکمرانوں کے سیاسی عزم میں ہے کہ وہ آئین کی اسلامی دفعات پر کماحقہٗ عمل نہیں کررہے تو آئین حکمرانوں کو انتخابات کے ذریعے بدلنے کا موقع مہیا کرتا ہے اور ہمارے دیکھے انتخابات کے ذریعے حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں لہٰذا ہتھیار اٹھانے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

۳۔ پاکستان کے کسی حکمران نے کفر بواح کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ پرویز مشرف نے تو کہا تھا کہ میں سیّد

ہوں، نماز پڑھتا ہوں، مجھ سے بڑا مسلمان کون ہے؟

۴۔ اگر فرض کیجیے کسی پاکستانی حکومت نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے بظاہر اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا جواز نکلتا ہے جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشرف اور زرداری حکومت نے افغانستان میں حملہ آور کفار کی فوجوں کا ساتھ دے کر اسلام سے غداری کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا ان کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز ہے لیکن اس مؤقف کے حامی دو چیزوں پر غور نہیں کرتے:

ایک: یہ کہ پاکستانی علماء کرام کی اکثریت نے موجودہ حالات میں حکمرانوں کے خلاف خروج و بغاوت کے جائز ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اس کے برعکس دہشت گردی اور مسلح مزاحمت کے خلاف فتوے ضرور آتے رہے ہیں۔

دوسرے: بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو بھی اس کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے، گنجائش نکلتی ہے، اس پر عمل پھر بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ ایسی کسی کوشش کے کامیاب ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ عصر حاضر میں ریاست اتنی طاقتور ہو گئی ہے اور اس کی جنگی مشینری اتنی ہولناک ہے کہ کوئی پرائیویٹ تنظیم اس سے لڑ کر فتح حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی، خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے کہ بین الاقوامی اسلام دشمن طاقتیں بھی ایسی حکومتوں کا ساتھ دیں گی۔ لہٰذا اس طرح کی کسی جہادی کوشش کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں جو ہر بنائے اجماع اہل سنت اب شرطِ اذن جہاد وخروج ہے۔

۵۔ اس طرح کی مسلح بغاوت کے شرعی نہ ہونے کے کچھ اور اسباب بھی ہیں:

۱۔ کفار کے پاس چونکہ عظیم الشان میڈیا مشینری موجود ہے (جو مسلمانوں کے پاس موجود نہیں ہے اور وہ اس کا توڑ نہیں کر سکتے) لہٰذا انہیں اِس جہاد کو دہشت گردی قرار دینے اور اس کے ذریعے اسلام کو بدنام کرنے کا سنہری موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ کفار نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کو دہشت گردی کا حامی قرار دے دیا ہے (اس بنیاد پر قرآن جلایا جا رہا ہے اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (فداہ ابی و امی) کی توہین کی جارہی ہے) اور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کیا جا رہا ہے اور کفار یہ جھوٹ اتنی کثرت اور تسلسل سے بولتے ہیں کہ دنیا کی رائے عامہ اس کو قبول کر رہی ہے۔

۲۔ اس سے کفار کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنے ساتھ ملا لیں اور کمزور ایمان مسلمانوں کو پیسے دے کر خرید لیں اور مسلمان ملکوں کے خلاف انہیں استعمال کریں۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ امریکہ و یورپ نے افغانستان میں بھارت کو ہماری مغربی سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے اور انہوں نے افغانستان اور وسط ایشیائی مسلم ممالک کے کمزور ایمان مسلمانوں کو خرید کر اور ان کی ذہنی تطہیر کر کے انہیں

مجاہدین کی صفوں میں داخل کردیا ہے اور انہیں پاکستان میں خودکش حملوں کے لیے استعمال کررہے ہیں اور نام مجاہدین کا استعمال کررہے ہیں۔

۳۔ مجاہدین اپنی کمزوری اور اپنے جانی و مالی نقصان کی بناء پر مشتعل ہوکر انتقام پر اُتر آتے ہیں اور ردعمل میں اسلام کی قائم کردہ حدود پر قائم نہیں رہ سکتے مثلاً اسلام جہاد میں غیر محارب لوگوں پر حملہ کرنے، عورتوں، بچوں، اور بوڑھوں پر ہاتھ اٹھانے اور فصلوں اور عمارتوں کو جلانے سے منع کرتا ہے لیکن جن مجاہدین نے حکومت پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں وہ غصے اور جوشِ انتقام میں یہ سب کررہے ہیں اور اگر کوئی مسلمان عالم ان سے اختلاف کرے تو اس کے بھی درپے ہوجاتے ہیں اور اپنے سے اختلاف کرنے والے علماء اور عوام پر کفر کے فتوے لگاتے اور انہیں مباح الدم سمجھنے لگتے ہیں۔

۴۔ ایک حادثہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے حکومت کو غیر اسلامی سمجھ کر اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں ان کی اکثریت معمولی خواندہ ہے اور ان میں ٹھوس علماء، محققین اور دانشوروں کی کمی ہے جس کے نتیجے میں وہ عصری مسائل، مشکلات اور حالات سے بڑی حد تک ناواقف ہیں اور پاکستان جیسے بڑے، جدید اور تزویراتی لحاظ سے اہم ملک کو متبادل خطوط پر چلا سکنے کے لیے درکار روژن اور صلاحیتوں سے محروم ہیں۔

ان حالات میں ہماری یہ دیانت دارانہ اور مخلصانہ رائے ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کفار حملہ آور ہوں (جیسے افغانستان میں ہوا) تو ان کی مزاحمت ضروری ہے اور ان کے خلاف جہاد فرض ہے لیکن جہاں تک ایک مسلمان ریاست کے غیر صالح حکمرانوں کا تعلق ہے، ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ ان کے خلاف کامیابی کا کوئی امکان نہیں، علماء کرام کا اس پر اتفاق نہیں اور کفار اس سے فائدہ اٹھاتے اور اسلام کو بدنام کرتے ہیں اور بے گناہ و معصوم عوام جنگ کی زد میں آتے ہیں اور اس کا کچھ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ کچھ مخلص اور دین کے لیے پُرجوش لوگ اللہ کی راہ میں قربان ہوجائیں لیکن اس سے مسلم ممالک کا نظام بہرحال تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ تجربہ اس سے پہلے انڈونیشیا، مصر، سعودی عرب، الجزائر اور کئی دوسرے مسلم ممالک میں ناکام ہوچکا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ پاکستان میں بھی اس کا تجربہ کیا جاتا؟

ہم نے سطور بالا میں دینی قوتوں کے برسر اقتدار آنے اور ریاستی قوت کو اسلامی تبدیلی کے لیے استعمال کرنے کی تین صورتوں (۱۔سیکولر سیاسی جماعتیں ۲۔عوامی قوت سے پُرامن انقلاب اور ۳۔خروج و بغاوت) کا ذکر کیا ہے کہ ان کے ذریعے تبدیلی آنے کا امکان نہیں۔ ریاستی سطح پر اسلام کے حق میں پہلے جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے وہ بھی دینی سیاسی جماعتوں نے ہی کیا ہے اور اب بھی ان ہی سے کچھ توقع کی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ اخلاص و فراست سے کام لیں، متحد ہوجائیں، مسلکی اختلافات سے اوپر اٹھیں اور ذاتی و جماعتی مفادات سے بالاتر ہوکر ملک میں اسلامی تعلیمات پر عمل کے ایک مشترکہ

پروگرام پر متفق ہو جائیں اور کامیابی کے لیے صرف سیاسی حکمت عملی پر انحصار نہ کریں بلکہ سماجی تبدیلی کے لیے بھی جدوجہد کریں جس کے لیے کچھ تجاویز ہم نے سطور بالا میں دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو دین کو سمجھنے اور عصر حاضر میں اس کی تعلیمات پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ربیع الاوّل کا پیغام حفیظ تائب ☆

نعت

دے تبسم کی خیرات ماحول کو ہم کو درکار ہے روشنی
ایک شیریں جھلک، ایک نوریں ڈلک، تلخ و تاریک ہے زندگی

اے نوید مسیحاؑ تری قوم کا حال عیسیٰؑ کی بھیڑوں سے ابتر ہوا
اس کے کمزور اور بے ہنر ہاتھ سے چھین لی چرخ نے برتری

کام ہم نے رکھا صرف اذکار سے، تیری تعلیم اپنا لی اغیار نے
حشر میں منہ دکھائیں گے کیسے تجھے ہم سے ناکردہ کار اُمتی

دشمنِ جاں ہوا میرا اپنا لہو، میرے اندر عدو میرے باہر عدو
ماجرائے تحیر ہے پُرسیدنی، صورتِ حال ہے دیدنی

روح ویران ہے، آنکھ حیران ہے، ایک بحران تھا، ایک بحران ہے
گلشنوں، شہروں، قریوں پہ ہے پرفشاں ایک گھمبیر افسردگی

سچ مرے دور میں جرم ہے، عیب ہے، جھوٹ فنِ عظیم آج لاریب ہے
ایک اعزاز ہے جہل و بے رہ روی، ایک آزار ہے آگہی

رازداں اس جہاں میں بناؤں کسے، روح کے زخم جا کر دکھاؤں کسے
غیر کے سامنے کیوں تماشا بنوں، کیوں کروں دوستوں کو دُکھی

زیست کے تپتے صحرا پہ شاہ عربؐ، تیرے اکرام کا ابر برسے گا کب
کب ہری ہوگی شاخِ تمنا مری، کب مٹے گی مری تشنگی

یا نبیؐ اب آشوبِ حالات نے تیری یادوں کے چہرے بھی دھندلا دیے
دیکھ لے تیرے تائبؔ کی نغمہ گری، بنتی جاتی ہے نوحہ گری

☆ بتصرف

ربیع الاوّل کا پیغام ڈاکٹر محمد امین

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا جھوٹا دعویٰ

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں اسلام لانے کی توفیق بخشی اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ بنا کر بھیجا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ کو رول ماڈل بنایا تاکہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کریں اور اپنی زندگی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام اور مرضی کے مطابق گزاریں جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گزاری تھی۔ امت کے جلیل القدر علماء اور محدثین نے عمریں لگا کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کو ہمارے لیے محفوظ طریقے سے مرتب و مدون کر دیا ہے اور آج وہ ہر معاشرے اور ہر زبان میں شائع شدہ اور بآسانی میسر ہیں اور کسی ایسے شخص کے لیے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کرنا چاہے یہ بالکل مشکل نہیں ہے کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مستند سنت اور سیرت تک رسائی حاصل کر سکے۔

ہم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں نہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت و سیرت سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں (کہ ہماری عمومی یا جدید تعلیم مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر ہے اور اس میں سنت و سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ برائے نام اور غیر مؤثر ہے) اور نہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس کے باوجود ہم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین کا شبہ بھی پڑے تو ملزم کا سر اتار دیتے ہیں۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے جان تو قربان کرنے کو تیار ہیں لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ کیسی محبت ہے؟ انسانی عقل کا تقاضا اور ہم سب کا مشاہدہ یہ ہے کہ آدمی جس سے محبت

کرتا ہے اس کی خوشنودی چاہتا ہے، اس کی بات مانتا ہے، وہ جو مطالبہ کرے اسے پورا کرتا ہے۔ ہماری رائے میں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ سے اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹے ہیں کیونکہ ہم زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں اور رسول اللہ (ﷺ) کی بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں! **فهل من مدّکر؟**

پاکستانیات مدیر

جھوٹا آدمی، سچی بات

قرآن حکیم نے منافقوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ تو سچی ہے لیکن یہ منافق اپنے دعویٔ ایمان بالرسالت میں ضرور جھوٹے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال کا آج ہمیں سامنا ہے کہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب بلاریب جھوٹے آدمی ہیں (کیونکہ وہ پاکستان کے واحد دینی وسیاسی رہنما ہیں جن کے بارے میں عدالت عالیہ فیصلہ دے چکی ہے کہ وہ جھوٹے، خائن، ناقابل اعتماد اور ذہنی مریض ہیں) لہٰذا ان کا جھوٹا، ناقابل اعتماد اور مغرب پرست ہونا تو ظاہر و باہر ہے بلکہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ انہیں زیر بحث لایا جائے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سیاست دان کرپٹ ہیں اور انہوں نے انتخابی نظام ایسا بنا رکھا ہے اور مجموعی سیاسی حالات ایسے پیدا کر رکھے ہیں کہ متوسط طبقے کا کوئی شریف آدمی اور اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرہ اور ریاست کے مسائل کے حل کا خواہاں کوئی فرد انتخابات میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا اس انتخابی نظام کو بدلا جائے۔ ہم ان کے اس مؤقف کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری اسٹیبلشمنٹ نے ایسی بہت سی رکاوٹیں اس مقصد سے کھڑی کر رکھی ہیں تاکہ انتخابات کے ذریعے حقیقی اور اسلامی تبدیلی نہ آسکے۔ ان میں سے چند اہم رکاوٹیں یہ ہیں: ۱۔ تعلیم عام نہ ہونے دینا ۲۔ غریبوں کو مہنگائی اور بے روزگاری میں مبتلا رکھنا کہ وہ دال روٹی کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں ۳۔ جاگیرداری نظام کو باقی رکھنا ۴۔ سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی کرنا اور انتخابات کو اتنا مہنگا بنا دینا کہ متوسط طبقے کا کوئی شریف آدمی انتخاب لڑ ہی نہ سکے ۵۔ برادری ازم، لسانی اور علاقائی تعصّبات کو ہوا دینا اور ان کی بنیاد پر ووٹ لینا ۶۔ امیدواروں کی تعلیمی واخلاقی اہلیت کی شرائط ختم کرا دینا (جیسے بی اے پاس ہونا) اور آئین کی دفعات 62,63 پر عمل نہ کرنا جو اخلاقی طور پر کمزور آدمی کو انتخابات میں حصہ لینے سے روکتی ہیں ۷۔ سازشوں اور پیسے کے زور سے علماء

کرام اور دینی جماعتوں کو آپس میں لڑانا تا کہ ان کی نا اتفاقی اور باہمی انتشار سے ان کا ووٹ بنک متاثر ہو اور یہ آسانی سے جیت جائیں ۸۔ انتخابات میں دھاندلی کرنا، جعلی ووٹ بنوانا، اپنی مرضی کی حلقہ بندیاں کروانا اور جعلی ووٹ بھگتانا وغیرہ ۹۔ ناقص انتخابی نظام جس میں معمولی اکثریت حاصل کرنے والا جیت جاتا ہے خواہ وہ صرف 20 فیصد ووٹ حاصل کرے ۱۰۔ فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ مل کر انتخابات کے نتائج بدلنا ۱۱۔ غیر ملکی طاقتوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کی حمایت حاصل کرنا، ان کی پالیسیوں پر چلنے کی یقین دہانی کرانا، ان سے پیسے لینا اور ان کی مدد سے اقتدار میں آنا۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۲۰ پر)

پاکستانیات　　　ڈاکٹر محمد امین

طالبان سے مذاکرات ضرور ہونے چاہئیں

ہمارے لیے یہ خبر خوشگوار حیرت کا سبب بنی کہ تحریک طالبان پاکستان نے حکومت پاکستان کو مذاکرات کی دعوت دی ہے۔ ہم اپنی اس غلطی کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا تاثر یہ تھا کہ تحریک طالبان پاکستان میں امریکی، یورپی و بھارتی مداخلت کا راتنے اندر گھس چکے ہیں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے سچے طالبان ان کی وجہ سے غیر مؤثر ہو چکے ہیں لیکن طالبان کے اس مطالبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی ایسے مخلص طالبان موجود ہیں جو حکومت پاکستان سے نفاذ شریعت کے حوالے سے اپنے مطالبات گفت وشنید سے منوانا چاہتے ہیں۔ اس سے خود بخود اس امر کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے تو وہ مسلح جدوجہد ترک کر کے پُرامن نفاذ شریعت کے عمل میں شریک ہو جائیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ تحریک طالبان پاکستان کی اس پیشکش کو کئی دن گزر چکے ہیں لیکن ہماری سیاسی وعسکری قیادت نے ابھی تک طالبان کو مثبت جواب نہیں دیا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہماری سیاسی قیادت اور ان کے اتحادی (خصوصاً پیپلز پارٹی، اے این پی اور متحدہ قومی موومنٹ) ابھی تک آمر مشرف کی امریکہ نواز پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں اور صرف اسی اساس پر اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور اپنی جیبیں بھر رہے ہیں کہ وہ امریکی غلامی کرتے رہیں اور ملک میں نفاذ شریعت کی مزاحمت کرتے رہیں لیکن حسین وعدوں کا لولی پاپ عوام کے منہ میں دیے رکھیں۔ اس لیے ہمیں ان سے توقع نہیں کہ وہ طالبان سے ڈائیلاگ میں دلچسپی لیں گے البتہ عسکری قیادت سے ہم اب بھی توقع کرتے ہیں کہ اسے اِس آپشن کو آزمانا چاہیے کیونکہ موجودہ صورت حال میں وہ نہ صرف ملک کی شمالی مغربی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر پا رہی اور ڈرون حملے نہیں روک پا رہی بلکہ بلوچستان، کراچی اور قبائلی علاقوں میں میں امریکی و

بھارتی دراندازوں کی دہشت گردانہ کاروائیوں نے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور فوج کا اوّلین فرض ہے کہ وہ ملک کو خارجی مسلح حملوں سے بچائے اور اسے ٹوٹنے سے محفوظ رکھے۔

اگرچہ صورت حال بہت پیچیدہ ہے لیکن اگر ملک بچانے کے لیے امن کی طرف پیش قدمی کی نیت سچی ہو، امریکی و یورپی غلامی سے نکلنا اور بھارتی بالادستی سے بچنا پیش نظر ہو اور طالبان سے مذاکرات کو کامیاب بنانا مقصود ہو تو ہم طالبان اور سیاسی و عسکری قیادت کے لیے دو قابل عمل تجاویز پیش کرنا چاہیں گے:

۱۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کی بنیاد 55 علماء کرام کے ان متفقہ 15 نکات کو بنایا جائے جو ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام تمام دینی مسالک کے مستند علماء کرام نے منظور کیے ہیں اور جن میں معاشرے کو درپیش تمام مسائل کا حل اسلامی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ شمالی مغربی قبائلی علاقوں کو ایک صوبہ بنا کر اسے نیم خودمختاری دے دی جائے جہاں لوگوں کو اپنے وژن کے مطابق اسلامی شریعت پر عمل کی آزادی ہو بشرطیکہ وہ پاکستان کے باقی صوبوں میں اسی وژن کے مطابق نفاذ شریعت پر اصرار نہ کریں۔ ملائشیا میں اس ماڈل پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے اور وفاق اور دوسرے صوبوں کے لیے اس نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔

ان دو تجاویز کے مثبت نتائج تبھی نکل سکتے ہیں جب ہماری سیاسی اور عسکری قیادت اخلاص نیت سے ان تجاویز پر عمل کرے اور اس طرح کی چالاکی سے لوگوں کی اشک شوئی کرنے کی کوشش نہ کرے جس کا مظاہرہ اس نے سوات میں اسلامی نظام عدل کے نفاذ کا ناٹک رچا کر کیا تھا کہ کورٹ بلڈنگ کو دارالقضاء قرار دے دیا اور داڑھی والے چند سول اور سیشن ججز کو قاضی کا لقب دے دیا اور ہائی کورٹ

بقیہ جھوٹا آدمی، سچی بات

ان حالات میں حقیقی تبدیلی لانے کی خواہاں کوئی جماعت خصوصاً اسلامی تبدیلی کی علمبردار دینی سیاسی جماعتیں آج تک کامیاب نہیں ہو سکیں اور اگر یہ حالات برقرار رہے تو آئندہ بھی کبھی نہیں جیت سکیں گی لہٰذا دینی سیاسی جماعتوں اور ایسی سیاسی جماعتوں کو جو حقیقی تبدیلی کی خواہاں ہیں (جیسے تحریک انصاف) چاہیے تھا کہ اس انتخابی نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتیں لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ تو خاموش ہیں اور جھوٹے اور شعبدہ باز طاہر القادری اس کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

کے ایک جج کو وہاں عارضی طور پر بھجوا دیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہاں ’اسلامی نظام عدل‘ قائم ہو گیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری سیاسی و عسکری قیادت اگر ہوش و تدبر کا ثبوت دے، صرف پاکستان کا مفاد پیش نظر رکھے اور امریکی ڈکٹیشن کے آگے نہ جھکے تو ان تجاویز پر عمل بالکل ممکن ہے اور پاکستان امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

علماء کرام سے معذرت کے ساتھ

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

ایک دردمند کی دعاء
علماء کرام کے لیے

یا اللہ! علماء کرام کو اسلام کا فہم، ایمان کی دولت، ہدایت کی روشنی، اللہ کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا شعور عطا فرما۔ یا اللہ! یہ تیرے بندے جنہیں ہم علماء کرام کے نام سے موسوم کرتے ہیں اگر راست فکر ہو جائیں تو مسلمانوں کا پورا معاشرہ راست فکر ہو جاتا ہے اور اگر یہ حضرات کج فکری پہ اتر آئیں تو کج فکری پورے معاشرے کا چلن بن جاتی ہے۔ اے رب العزت! تو ہمارے ان راہنماؤں کو دین کے معاملے میں راست فکری عطا فرما اور انہیں کج فکری سے محفوظ فرما۔ اے رب دو جہاں! تیرے اس جہانِ فانی میں انسانوں کا امن و چین اور ان کی ترقی و سر بلندی، دینِ اسلام اور صرف دینِ اسلام کی سر بلندی سے وابستہ ہے مگر دینِ اسلام کی سر بلندی کا راستہ خبطِ عظمت کا شکار تیرے یہ بندے جنہیں ہم علماءِ کرام سمجھتے ہیں، اپنے خود ساختہ مسلکی اختلافات کے زور پر روکے ہوئے ہیں۔ یا اللہ! اپنے ان بندوں کو مسلکی اختلافات کی بیماری سے نجات دلا تا کہ یہ تیرے دین کی سر بلندی کا پرچم محکم اتحاد، پوری قوت اور دلی اخلاص کے ساتھ بلند کر سکیں۔ یا ربِ عظیم! ہم تیرے لاچار اور بے بس بندے تیرے حضور دست بدعا ہیں کہ علماء سو کو علماء حق بننے کی توفیق عطا فرما۔ انہیں حق سنانے، حق سمجھانے اور حق دوسروں

تک پہنچانے کا وسیلہ بنا۔ یہ تیرے بندے تیرے دین سے واقف تو ہیں لیکن اس کا درست فہم نہیں رکھتے ۔اے ربِ کعبہ انہیں دین کا درست فہم عطا فرما تا کہ یہ نہ صرف اسے اپنی ذات پر لاگو کریں بلکہ امتِ محمدیہ کو بھی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں لاگو کرنے کی تلقین فرما سکیں۔ یہ لوگوں کو تو اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑنے کی اور تفرقہ نہ ڈالنے کی بات سناتے ہیں لیکن خود پیٹ کی خاطر، اپنی انا کی تسکین کے لیے اور اپنی قیادت و سیادت کا پرچم بلند کرنے کی خاطر تفرقہ بازی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں۔ تیری رسی کو مضبوطی سے تو کیا پکڑیں گے اُسے تو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ یا اللہ! اپنے ان بندوں کو جنھیں عرفِ عام میں علماء کرام کہا جاتا ہے **لم تقولون مالا تفعلون** پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ یا رب العزت! مساجد تو مسلمانوں کے لیے امن کا گہوارہ ہوا کرتی تھیں، یہ تو مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان ہوتی تھیں، یہاں آ کر لوگ روحانی سکون، جسمانی آرام اور ذہنی بالیدگی حاصل کرتے تھے۔ یہ مساجد ایمان کی پختگی اور عمل کا

☆ ڈائریکٹر الفوز گرلز کالج جوہر آباد، خوشاب

جوش پیدا کرتی تھیں، یہ کیا ہوا کہ انہیں چیخ و چنگھاڑ کا مرکز بنا دیا گیا، جنگ و جدل کے سوتے ان سے پھوٹنے لگے، انہیں قصے کہانیوں کا محور بنا دیا گیا، یہاں اختلاف و انتشار کی لہریں ابھرنے لگیں اور یہ تعلیم و تربیت کا مرکز ہونے کی بجائے تخریب و تنقید کا منبع بنا دی گئیں۔ یا رب کریم! یہ سب کچھ اُن "شرفاء" کے ہاتھوں اور زبانوں سے ہوا جنھوں نے تیرے دین کی ترویج اور سر بلندی کے لیے جانیں کھپانی تھیں، ملتِ اسلامیہ کی قیادت کرنا تھی، مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں ڈھالنا تھا، شریعت اسلامیہ کو معاشرے میں جاری و ساری کرنا تھا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہ سب کچھ نہیں ہو رہا اور وہ کچھ ہو رہا ہے جس سے تُو ناراض ہوتا ہے اور جس سے قوموں پر تیرا غضب نازل ہوتا ہے۔ یا رحمن و رحیم! تو اس ساری صورتِ حال کو بدل دے اور مساجد کو امن، سکون، تعلیم اور عملِ صالح کا گہوارہ بنانے کی توفیق عطا فرما۔

کہتے ہیں سیکولر قوتیں اس ملک میں سر اُٹھا رہی ہیں۔ وہ کیوں سر نہ اُٹھائیں۔ وہ منظم ہیں، اپنے باطل نظریات کے ساتھ مخلص ہیں اور ان کی ترویج کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ شر کی ان قوتوں میں اتحاد ہے، اتفاق ہے، باہمی ربط ہے اور ایک دوسرے کے لیے محبت اور احترام ہے۔ دوسری طرف اسلامی قوتیں جن کی قیادت علماء کرام کے ہاتھوں میں ہے، منقسم ہیں، ان میں اخلاص کی کمی ہے، محنت مفقود ہے اور اتحاد و اتفاق کہیں نظر نہیں آتا۔ آج اگر مسلمان ملتِ واحدہ کی شکل اختیار کر لیں تو کفر

'الکفر ملۃ واحدہ' ہونے کے باوجود خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔ آج اگر مسلمانوں کی قیادت پر فائز علماء کرام متحد و متفق ہو جائیں تو سیکولرزم کے پجاری ہوا میں تنکوں کی طرح اُڑ جائیں گے۔ سیکولر نظام کے علمبرداروں کی مسلمانوں کے اس عظیم ملک میں کوئی حیثیت نہیں۔ ان کی حیثیت ہمارے علماء کرام کے افتراق و انتشار نے بنا رکھی ہے۔ اے رب رحیم! تو ہمارے علماء کرام کو اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال کر۔

یا اللہ! ہم مانتے ہیں کہ شر اور نفاق کی اس دنیا میں تیرے دین کا نظر آتے رہنا ان علماء کرام کی وجہ سے ہے لیکن مولا کریم یہ بھی حقیقت ہے کہ دین کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک پاکستان میں دین کے عملی نفاذ کا راستہ بھی یہی علماء کرام روکے ہوئے ہیں۔ یہ آج اکٹھے ہو جائیں تو کوئی سیاستدان، کوئی جرنیل، کوئی بیوروکریٹ دینِ اسلام کا راستہ نہیں روک سکتا۔ یا اللہ! علماء کرام اور ان کے مقتدیوں کو اکٹھا ہونے کی توفیق عطا فرما۔ یا اللہ! تیرے دین کے ماننے والے لاکھوں کی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی تبلیغی اجتماع میں، کبھی تحریکی اجتماع میں اور کبھی دعوتی اجتماع میں لیکن معاشرے کے عمومی کردار پر ان کا

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ وطالبات کے لیے 250روپے سالانہ

نام.. پتہ..

.... فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ B-369، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

کوئی اثر قائم نہیں ہوتا اور ہو بھی کیسے؟ کیونکہ ان کے راہنما یہ علماء کرام (خاکم بدہن) دین کی خاطر کم اور اپنا مسلکی اور مذہبی اور سیاسی رعب جمانے کے خاطر انہیں زیادہ اکٹھا کرتے ہیں۔ اپنے رعب کو دوبالا کرنے کے لیے یہ دین کے نام لیوا عام سیاستدانوں کی طرح ایک لاکھ کے دس لاکھ بنا کر میڈیا میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ خبطِ عظمت کا شکار یہ تیرے نام نہاد دیندار بندے اسلام کی عظمت کی بجائے اپنی اور اپنے مسلک اور اپنی جماعت کی عظمت کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ یا رب العزت! یہ تیرے دین کے نمائندے ہیں انہیں خبطِ عظمت کے روگ سے محفوظ فرما۔ یا رب کریم! تیرے دین کے ہم مجبور اور بے بس بندے عیاروں کی عیاریوں کا شکار ہیں۔ اے رب دو جہاں! ہمیں عیاروں کی عیاریوں سے بچا۔ ہمیں سچی اور مخلص دینی اور سیاسی قیادت عطا فرمایا۔ اے اللہ! اسلام کو دنیا کی غالب قوت بنا دے۔ اگر ہمارے ہاتھوں ممکن نہیں تو یا اللہ! تُو کسی توانا قوم کو اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرما تاکہ تیرا دین اس توانا قوم کے ہاتھوں سربلند ہو اور ہم جیسی گری پڑی قوم بھی قیامت آنے سے پہلے دین کی دنیاوی رحمتوں سے لطف اندوز اور آخرت کی کامیابیوں کی امید باندھ سکے۔ آمین یا رب **العالمین!**

تزکیۂ نفس

جناب احمد جاوید

دعاء مانگنا سیکھیے (آخری قسط)

س: اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ دعاء کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے اور یہ نفس انسانی پر بہت بنیادی اثرات مرتب کرتی ہے تو مناسب ہے کہ اس کی کچھ توضیح ہو جائے۔

ج: دینی اصطلاح میں جس چیز کو اخلاق کہا جاتا ہے وہی مسلمان کی نفسیات ہے۔ اخلاق انسان کے مجموعی شعور اور طبیعت کے وہ ملکات ہیں جن پر اس کی نفسیاتی عمارت کھڑی ہوتی ہے یعنی اخلاق نفس انسانی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اس معنی میں ہم اسے نفسیات کہہ رہے ہیں۔

ایمان شعورِ بندگی کی اساس ہے، عبادت بندگی کی طبیعت کا خاصا ہے اور اخلاق ان کا لازمی نتیجہ۔ بالفاظ دیگر انسان کو قربِ حق اور خیر کی جس فطرت پر خلق کیا گیا ہے، ایمان اس کا شعور ہے، عبادت اس کا تقاضا ہے اور اس شعور اور اس تقاضے کی تکمیل نفس میں جو مستقل اوصاف پیدا کرتی ہے، ان کا نام اخلاق ہے۔ بندہ اپنی فطرت پر شعوراً، عملاً اور حالاً قائم ہو جائے تو اس کی بدولت اس کے نفس کی ماہیت دین کے مطلوبہ ملکات سے مل کر متعین ہوتی ہے۔ گویا انسان کی نفسیاتی شناخت ہمیشہ اس کے اخلاق کی بنیاد پر ہو گی۔ اخلاق اچھے ہیں تو شخصیت نارمل یعنی معیاری ہے اور اخلاق برے ہیں تو شخصیت ابنارمل ہو گی یعنی غیر معیاری۔

خود اخلاق کا قیام تعلق کی اسی فکری اصل پر ہے جس کی حفاظت، تربیت اور ترقی کے لیے دین اترا ہے۔ تمام عبادات بالخصوص دعاء اللہ سے تعلق کو اور بندے کی حقیقی پوزیشن کو ذہنی ہی نہیں بلکہ طبعی سطح پر بھی حاضر رکھتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دعاء سے مناسبت رکھنے والا بندہ کسی نفسیاتی کجی یا نقص میں مبتلا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دعاء تعلق کی سچائی اور تعلق کے آداب کو ملحوظ رکھنے کو ایک طبعی امر بنا دیتی ہے اور جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ یہ تین چیزیں محفوظ اور مستحضر رہیں تو نفس انسانی کی تشکیل کا پورا عمل خیر کی بنیاد پر جاری رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام نفسیاتی عوارض اگر کسی ایک علاج سے ٹھیک ہو سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ نفس اپنی مثالی فطرت کے تابع ہو۔

دیگر تفصیلات سے قطع نظر ایک نقطہ ضرور ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ نفسِ انسانی انفرادیت اور اجتماعیت

دونوں کا بانی ہے یعنی انسان کا باطن اس کی انفرادیت ہے اور انسان کا ظاہر اس کی اجتماعیت۔ مذہبی نفسیات ان دونوں پہلوؤں کا پورے توازن کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ اخلاق باطنی ہوں تو نفس کے ذاتی احوال ہیں اور ظاہری ہوں تو ایک مبنی بر خیر معاشرت۔ فرد ہو یا معاشرہ دونوں کی اساس یکساں اخلاق پر ہے۔ دعاء سے پیدا ہونے یا ابھرنے والی قوت تعلق، جسے ہم نے اخلاق کی اصل کہا ہے، ایک معاشرت بھی تشکیل دیتی ہے۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ ہمیں جس سے محبت ہوتی ہے اس کے لیے ہمارے پاس سب سے قیمتی تحفہ یہی دعاء ہے۔ آپ خود سوچیے کہ ایک دوسرے کے لیے دعاء گو رہنے کا ماحول حسنِ معاشرت میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

س: دعاء کے قانونی آداب تو معروف ہیں، آپ ہمیں کچھ خصوصی آداب سے روشناس کرائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ یہ غیر معروف ہیں۔

ج: دعاء کرتے وقت درج ذیل چند چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۔ دعاء ایک مکمل عبادت ہے صرف ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس عمل میں نیت بھی عبادت کی ہونی چاہیے اور کیفیت و حالت بھی۔

۔ عبادت کے ساتھ ساتھ دعاء استعانت بھی ہے یعنی حاجت روائی کے لیے اللہ کو پکارنا۔ اس میں نازک بات یہ ہے کہ احتیاج کی بنیاد کسی مخصوص چیز کی محتاجی کی بجائے اس جذبۂ بندگی پر ہونی چاہیے جو اللہ کے آگے گڑگڑانے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ ضرورت کی تکمیل بندے کو وہ تسکین نہیں دیتی جو اس یقین سے میسر آتا ہے کہ میرا مالک میرا معبود میری پکار سن رہا ہے۔

۔ دعاء پورے یقین سے کی جاتی ہے مگر اصرار اور شرط کبھی نہیں بنتی۔ اس یقین کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ اللہ میری سن رہا ہے اور دوسرا یہ کہ اس دعاء کے جواب میں اللہ جو فیصلہ بھی کرے گا وہی بہتر ہوگا۔

۔ دعاء کا سب سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے اور بندگی میں سچائی، پختگی اور کمال میسر آتا ہے۔

۔ انہماک، عاجزی، یکسوئی اور جو مانگا جا رہا ہے اس کا پورا استحضار دعاء کے لیے ضروری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کم ہوئی تو یہ عمل ناقص ہے۔

۔ دعاء میں آخرت سے وابستہ ضروریات کو دنیاوی حاجات پر ترجیح ہونی چاہیے۔ یہ ترجیح باطنی بھی ہے اور ظاہری بھی یعنی آخرت کی فلاح طلب کرنے میں دل زیادہ لگنا چاہیے اور وقت بھی زیادہ صَرف ہونا چاہیے۔

۔ وہی دعائیں کرنی چاہئیں جن کے بارے میں پہلے سے معلوم ہے کہ یہ اللہ کو پسند ہیں یعنی مسنون

دعائیں اور مسنون طریقۂ دعاء۔ مسنون دعاء اور مسنون طریقۂ دعاء کی ایک تاثیر یہ ہے کہ نفس بندگی کی حقیقت پر ڈھلنے لگتا ہے۔

۔ اللہ کو لفظوں سے یا مصنوعی طریقوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ایسی کوششیں وہی کرتا ہے جس کا باطن خالی ہو۔

۔ دعاء اللہ کی ثنا کے بغیر بے روح ہے اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ دس فقرے ثنا کے کہتے تھے اور پھر ایک جملہ حاجت کا زبان پر لاتے تھے۔

۔ دعاء کا بہترین موقع یہ ہے کہ نفل نماز کے دوران مانگی جائے۔ اس کے بعد ہر نیک کام کے اول و آخر میں اور ہر غلطی کے صدور کے فوراً بعد۔

۔ اچھی دعاء کا ایک کلیہ ہے کہ 'اچھی نماز'۔ جس کی نماز اچھی نہیں اس کی دعاء کبھی اچھی نہیں ہو سکتی۔

۔ دعاء کی قبولیت کی دو مزید شرائط ہیں: کثرتِ ذکر اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی عادات مبارکہ کی پیروی۔ دعا سے پہلے اور بعد درود شریف پڑھنا۔

۔ کبھی کبھی محض دعاء کرنے کے لیے دو رکعت نماز کا اہتمام کر لینا چاہیے۔

۔ دعاء میں اپنی حیثیت اور اللہ کی شانِ فضل دونوں کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔

۔ دعاء میں دوسروں کو التزاماً شامل رکھنا چاہیے۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کو، والدین کو اور اولاد کو۔

س: دعاء کے بندے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ گو فوائدِ دعاء کی خاصی تفصیل اس گفتگو میں آ چکی ہے تاہم یہ بہتر ہوگا کہ ان کی بھی ایک فہرست بنا دی جائے تاکہ ذہن ان فوائد کو آسانی سے محفوظ کر سکے۔

ج: بہت بہتر! دعاء کے مجموعی اثرات اور فوائد کی ضروری فہرست کچھ یوں ہے:

۔ تمام دینی اور روحانی فضائل کے حصول میں اس کا بنیادی کردار ہے۔

۔ دعاء استعانت کا ادب اور مقصد سکھاتی ہے۔

۔ دعاء مفادِ عاجلہ اور حبِّ دنیا سے پاک کرتی ہے۔

۔ **دعاء ایمان کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔** توکل، تقدیر پر راضی رہنا، اللہ کو حاجت روا ماننا، اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی پر غالب رکھنا اور اسے سمیع و علیم اور مجیب و مالک جاننا ایمان کے بنیادی تقاضوں میں داخل ہے۔ دعاء سے مناسبت پیدا کیے بغیر اللہ پر ایمان کے یہ بنیادی تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

۔ **خواہشات پر قابو پانے کی قدرت:** دعاء عرضِ حاجت ہے مگر بندے میں ایک ذوق ضرور پیدا کرتی ہے کہ میری احتیاجات لامحدود نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ذوق خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

۔ **عاجزی اور تواضع:** کیونکہ دعاء کا مزاج رکھنے والا بندہ طبعاً عاجز اور متواضع ہوتا ہے۔

۔ مخلوق سے توقعات کا خاتمہ۔

۔ **رقت قلبی:** یہ وصف تعلق باللہ میں نہایت کارآمد ہے اور حقوق العباد کی ادائی میں بھی اس کا بڑا کردار ہے۔

۔ **کیفیت احسان کا حصول:** دعاء فطری طور پر اللہ کی طرف یکسوئی پیدا کرتی ہے جو شریعت کی اصطلاح میں احسان ہے۔

۔ **دوام ذکر۔** دعاء کی حقیقت میسر آ جائے یعنی بندہ ہمہ وقت احساسِ بندگی اور استحضارِ ربوبیت سے مشرف ہو جائے تو یہی دوامِ ذکر ہے۔ دعاء اس کا نہایت قابل اعتماد وسیلہ ہے۔

۔ **دوسروں کی خیر خواہی اور ان کے لیے فائدہ رسانی کی صلاحیت میں اضافہ۔**

۔ **الحب للہ و البغض للہ کی نعمت کا حصول:** مومن کی دنیاوی زندگی کا خلاصہ یہی ہے کہ اس کی محبت بھی اللہ کے لیے ہو اور عداوت بھی۔ اس کے بغیر مسلمان ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اللہ کا سچا بندہ اس محبت اور عداوت کا سب سے پہلا اظہار جس چیز میں کرتا ہے وہ دعاء ہے۔ گویا یہ انتہائی بنیادی وصف دعاء سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۔ **ذوقِ عبادت میں ترقی:** ظاہر ہے کہ دعاء کا فوری تقاضا عبادات میں کثرت اور انہماک ہے۔

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مزاجِ اقدس سے مناسبت کا حصول

۔ **تقدیر اور عمل میں موجود حقیقی توازن کے شعور کی فراہمی:** یہ ایک دقیق نکتہ ہے۔ دعاء میں ایک بہت بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ بندے کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہوئے تدبیر اور عمل سے فارغ اور غافل نہیں رہتا۔ اس کا بیان تو بہت علمی ہو جائے گا سر دست یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

س: ان خرابیوں کی فہرست بھی بنا دیں جو دعاء میں نقائص کا موجب بنتی ہیں؟

ج: بے یقینی: دعاء کی قبولیت کا یقین درکار نہیں ہے لیکن یہ یقین بہت ضروری ہے کہ اللہ میری پکار سن رہا ہے اور وہی ہے جو میری دعاء کو پورا کرے گا۔

۔ **بے توجہی:** رٹے ہوئے الفاظ کی طرح دعاء کے کلمات کو بے دھیانی کے ساتھ ادا کر دینا دعاء کے نام پر ایک مذاق ہے۔ یہ غفلت، ناشکری اور اللہ سے لاتعلقی کی بدترین مثال ہے۔

۔ **دعاء کے الفاظ کا مطلب نہ جاننا:** یہ بھی ایک سنگین غلطی ہے اور دعاء کی سپرٹ ہی سے متصادم ہے۔ ایسی صورت میں نہ دعاء عبادت رہتی ہے نہ استعانت۔ پھر نفس پر اس کے جو اثرات مرتب ہونے چاہئیں وہ بھی نہیں ہوتے۔

۔ **اپنی حیثیت کو ملحوظ نہ رکھنا:** مثلاً ایک معمولی ذہن والے آدمی کا یہ دعاء کرنا کہ اللہ اسے امام ابوحنیفہؒ جیسا عالم بنا دے۔ ایسی خواہش یا تو تکبر سے پیدا ہوتی ہے یا غیر سنجیدگی اور حماقت سے۔

۔ **اللہ کی شانِ عطاء کا غلط تصور رکھنا:** یعنی کچھ مانگتے وقت اس خیال میں مبتلا ہو جانا کہ یہ تو بہت بڑی چیز ہے مثلاً سب کافروں کے لیے ایمان کی دعاء، دنیا کے دارالاسلام بن جانے کی تمنا کا اظہار یا کسی ناقابل علاج بیماری سے نجات پانے کی التجا یا اپنے ناقص اعمال کی بناء پر جنت الفردوس کی دعاء نہ مانگنا۔

۔ دنیا کی محبت یعنی دنیا کی خواہشات کو اخروی فلاح پر ترجیح دینا۔

۔ مسنون دعاؤں کا اہتمام نہ کرنا۔

۔ دعاء کو ذکر و عبادت اور حمد و ثنا کی بجائے محض اظہارِ ضرورت سمجھنا

۔ رزق کا حرام یا مشتبہ ہونا

۔ دعاء میں دوسروں کو شامل نہ کرنا۔

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ وسلام نہ بھیجنا۔

۔ اچھی نماز نہ پڑھنا۔

۔ قرآن سے مناسبت نہ ہونا۔

۔ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوق کا فقدان۔

۔ خوداحتسابی کی عادت کا نہ ہونا

س: دعاء تو طرح طرح کے جذبات اور ضروریات کا اظہار ہے۔ ہر شخص خود کو پیش آنے والے تمام احوال سے متعلقہ مسنون دعائیں نہیں جانتا۔ اس صورت میں دعاء کے مسنون صیغوں پر اصرار کی کیا افادیت اور معنویت ہے؟

ج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعاؤں کو تعلیم و تلقین کا موضوع بنایا کرتے تھے جو تمام ممکنہ احوال و ضروریات

کا بدرجہ کمال احاطہ کرتی ہیں لیکن اگر کسی کو مسنون دعائیں یاد نہ ہوں تو وہ دعاء اپنی زبان میں قبولیت کی پوری امید کے ساتھ مانگ سکتا ہے اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ ہمارے اصرار کا مقصد یہ ہے کہ مسنون صیغوں کی پابندی کرکے ایک تو ہم دعاء کو عبادت اور ذکر کے درجے تک پہنچا سکتے ہیں اور دوسرے اپنے احساسات، جذبات اور احتیاجات کو بندگی کی اعلیٰ سطحوں سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں ہمیں یہ بھی سکھا دیتی ہیں کہ سچے بندے کی ضرورتیں کیا ہوتی ہیں۔ کم از کم یہ دو فائدے ایسے ہیں جو غیر مسنون دعاؤں سے اطمینان بخش حد تک حاصل نہیں ہو سکتے۔ درج ذیل بعض اور نکات بھی ہیں انہیں بھی جان لینا چاہیے:

۱۔ دعاء عبادت کا مغز ہے۔ عبادت کو بھی مسنون ہونا چاہیے اور اس کے جوہر کو بھی۔ مسنون دعاؤں کی طرف سے غافل رہ کر آدمی اس تقاضے کو پورا نہیں کر سکتا۔

۲۔ دعاء کے مشمولات بندے کے مرغوبات کی سب سے یقینی فہرست کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ مشمولات مطابق سنت ہو جائیں تو بندے کو ایک بہت بڑی دولت میسر آ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی پسند ناپسند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند ناپسند کے تابع ہو جاتی ہے۔

۳۔ دعاء جیسی عظیم عبادت مطابق سنت نہ ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع یقیناً ناقص رہ جاتی ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔

۴۔ دعاء کا مسنون صیغہ عبادت کا اطمینان اور قبولیت کی قوی امید پیدا کر دیتا ہے۔

س: بہت خوب! اب یہ بھی بتا دیجیے کہ دعاء کی قبولیت کا صحیح تصور کیا ہے؟

ج: اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی مستقل نیت کے ساتھ کی جانے والی ہر دعاء مقبول ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم قبولیت کا یک رخا اور خودغرضی پر مبنی مطلب نہ لیں۔ بعض اوقات دعاء کی قبولیت اپنی مرضی کے مطابق ظاہر ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مخفی رہتی ہے۔ ہم جو مانگتے ہیں وہ نہیں ملتا۔ ہم جو چاہتے ہیں نہیں ہوتا۔ ایسے مواقع پر یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری دعاء رائیگاں گئی بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میری مانگی ہوئی چیز کو روک کر اللہ میرے صبر و شکر کی شرط پر وہ چیزیں عطا فرمائے گا جس کا میں اِس زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو مانگا تھا وہ بہرحال محدود تھا، اس کے نہ ملنے پر راضی رہنے سے اللہ مجھے وہ کچھ دے گا جو اتنا غیر محدود ہے کہ اس دنیا اور اس زندگی میں نہیں سما سکتا۔ دوسرے لفظوں میں دعاء کے بعد دو کیفیات ضرور حاصل ہوتی ہیں ایک شکر اور دوسرے صبر۔ یہ دو چیزیں حاصل ہوں تو دعاء کی قبولیت کا یقین رکھنا چاہیے۔

تعلیم وتربیت

جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی ☆

پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ میں تحقیق

تحدیات اور تقاضے

پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ میں تحقیق کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی دوروزہ ورکشاپ منعقدہ ۹، ۱۰ جنوری ۲۰۱۳ء سے جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی کا کلیدی خطاب

حمدو ثناء کے بعد،

اسلامی تحقیق میں معیار کا حصول اور جستجو ایک فطری امر ہے۔ یہ معیار زندگی کے ہر شعبہ میں، ہر علم وہنر میں مطلوب ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانی تہذیب میں کوئی ترقی، کوئی وسعت نہیں ہوسکتی تھی۔ دنیا کے ہر ملک، معاشرہ اور ثقافت میں ترقی اور عروج کا حصول اور اس کے لیے مسلسل کوشش کرنا اور تمام صلاحیتوں اور ہر ممکن وسائل کا خرچ کرنا تاریخ انسانی کا لازمی حصہ رہا ہے۔ آج بھی ہر جگہ یہ جدوجہد جاری ہے اور انسانی زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہے گی۔

پھر اسلامی تحقیق کے میدان میں تو بطریق اولیٰ یہ ہم سب کا مقصد ہونا چاہیے، اس لیے کہ یہی علوم و معارف کی وہ اعلیٰ ترین سطح ہے جہاں تک انسانوں کی رسائی ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ علوم الوحی سے اعلیٰ اور ارفع کسی اور علم کی حیثیت نہیں ہوسکتی؛ بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، یہ علم وہ ہے جو اس قابل ہے کہ اس کی خاطر زندگی کے بہترین لمحات وقف کردیے جائیں اور بہترین وسائل کو اس میدان کھپا دیا جائے۔ یہ ایک ظاہر اور بدیہی بات ہے کہ خود خالق کائنات کی مرضی اور منشا کا علم اس کی بنائی ہوئی مادی دنیا یا اس کی مخلوق حیوانی یا انسانی زندگی کے بارے میں معلومات سے بہرحال افضل اور برتر ہوگا۔ اس لیے اگر مسلسل ترقی اور اعلیٰ معیار علم کے کسی بھی شعبہ میں قابل حصول ہے تو اسلامی تحقیق کے میدان میں تو یہ بہت زیادہ ضروری ہے۔

ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلامی علوم کی دنیا، جس سے ہم اور آپ وابستہ ہیں، اس کے بنیادی طور پر تین دائرے ہیں اور ہماری ساری سرگرمیاں اور کاوشیں انہی تینوں دائروں میں گردش کرتی ہیں یا یوں کہیے کہ ان تینوں دائروں میں ان کو گردش کرتے رہنا چاہیے۔ پہلا دائرہ عام معاشرہ کا ہے یعنی ہماری علمی جدوجہد کے اثرات ہماری سماجی زندگی پر نظر آنے چاہئیں اور اس ملک کے

عام مسلمانوں کو بہر حال اس حد تک اسلامی تعلیم ضرور حاصل کر لینی چاہیے کہ جس سے:

☆ جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان (شریعت اپیلنٹ بنچ) و پروفیسر ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۔ ان کے عقائد درست ہو جائیں، بالفاظ دیگر ان کے دل و دماغ میں وہی کائناتی نظریہ مستحکم ہو جو اسلام نے ہمیں عطا کیا ہے اور جس کے بغیر ساری اسلامی تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت پر ہمارا پختہ ایمان و یقین ہے۔ ایک مسلمان دنیا کو اسی نظریہ کی معرفت سے دیکھتا اور سمجھتا ہے اور یہی ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا اساسی نظریہ کائنات (World View) ہے۔

۲۔ دوسرا عمومی ہدف اسلامی تعلیم کا یہ ہے کہ لوگوں کی عبادات درست طریقہ پر منضبط ہو جائیں اور اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے راسخ ہو اور مسلسل رو بہ ترقی رہے۔

۳۔ تیسرا ہدف عام معاشرہ کی اسلامی تعلیم کا یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے تمام معاملات، انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کے درمیان آپس کے تعلقات کی تنظیم ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ ان کے روابط کی ترتیب، یہ سارے حقوق و فرائض اور اخلاق و آداب احکام شریعت کے مطابق استوار ہو جائیں۔ یہ ہیں وہ بنیادی اہداف جو ایک عمومی اسلامی تعلیم کے پیش نظر رہنے ضروری ہیں۔ ان تینوں میں ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا جائزہ بھی ہمیں لیتے رہنا چاہیے۔

دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں ہم اور آپ اور ہمارے سب رفقاء براہ راست شریک ہیں۔ اس کا ہدف وہ حضرات ہیں جو اسلامی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آتے ہیں۔ اس مہارت کا تعلق پڑھنے پڑھانے سے بھی ہے اور تصنیف و تالیف کے مشاغل سے بھی۔ ہم سب مختلف حیثیتوں میں اس عظیم امانت کا بوجھ اٹھائے کھڑے ہیں۔ چاہے ہم تدریس کے کام سے وابستہ ہوں یا تدریس کے ساتھ ساتھ مزید تحقیق کے کام میں مشغول ہوں یا اس سے بڑھ کر آئندہ کے لیے علوم اسلامیہ کے ماہر اساتذہ اور محققین کی رہنمائی اور تربیت کے عمل سے وابستہ ہوں۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق اور فضل سے ہی اس قابل ہوئے ہیں کہ اس بابرکت اور عظیم الشان ذمہ داری پر مامور کیے جائیں۔ درحقیقت یہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے جو ہمارے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے یہ بظاہر 'تشریف' مگر دراصل 'تکلیف' ہے۔ کیوں کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس میں انسان کی بطور خلیفة اللّٰہ فی الأرض کے اعلیٰ منصب پر تقرری کا براہ راست تعلق ہماری موجودہ ذمہ داری سے ہے اور ہماری اس تعلیمی و تحقیقی سرگرمی سے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بنایا، اس کی ہدایت کے لیے انبیاء اور رسولوں کو مبعوث فرمایا اور خاتم الانبیاء والمرسلین کے ذریعہ اس سلسلۂ تعلیم و ہدایت کی تکمیل فرمائی۔ اب تا قیامت اس آخری ہدایت الٰہی کو تعلیمات نبوی کی روشنی میں انسانوں تک پہنچایا جاتا رہے

گا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ایک جماعت کو ہمیشہ تیار کرتا رہے گا۔ جس دن اس ہدایت کا سلسلہ منقطع ہوا وہی اس کائنات کا آخری دن ہوگا۔ جس لمحہ اس کائنات میں جاری وساری لا الہ الا اللہ کا اعلان انسان کی جانب سے ختم کیا گیا اسی آن قیامت قائم ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ سارا نظام ہستی ہمارے اس ایمان پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس واضح حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم ایسوں پر کیسی بھاری امانت کا وزن ڈالا گیا ہے۔ اس کی ادائیگی کا دارومدار یقینا توفیق الٰہی پر ہے۔ اس کام میں ہماری ذمہ داریاں جتنی بھی محدود ہوں مگر بہرحال وہ ذمہ داریاں ہیں اور بے حد اہم ہیں اور ہم سب سے سنجیدہ اور ہمہ وقت لگن کے ساتھ بھرپور سرگرمی کا مطالبہ کرتی ہیں۔

ہمارے اس منصب کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے موجودہ دائرہ سے تیسرے دائرہ میں داخل ہوں یہی وہ دائرہ عمل ہے جو میری آج کی معروضات کا اصل موضوع ہے۔ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا، علوم اسلامیہ کے میدان میں مسلسل ترقی، گہرائی، وسعت اور بلند پرواز کی ضرورت اظہر من الشّمس ہے، یہ ضرورت زندگی کے کسی اور شعبۂ اختصاص پر علی الاطلاق فوقیت رکھتی ہے اور ہمارے میدانِ عمل کے تمام شعبہ ہائے اختصاص میں ترقی کا یہ عمل انتہائی ضروری ہے، یعنی علوم اسلامیہ کے شجرہ طیبہ کی ہر ہر شاخ میں برگ وبار لانے اور اس کو مسلسل ثمر بار کرنے کا عمل بہرحال ہمیں کرنا پڑے گا اور خدانخواستہ اگر ہم نہ کر سکے تو کوئی اور یہ کام کرے گا لیکن یہ کام بہرصورت ہو کر رہے گا۔ یہ ایسا شعبۂ مہارت ہے جو زوال کا شکار کبھی نہ ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو بالاۤ کید واجب الوقوع ہے کیوں کہ یہ واجب الوجود کا وعدہ ہے اور اٹل وعدہ ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ ظاہر ہے کہ اس محکم قرآنی اعلان میں حفاظت سے مراد صرف نص قرآنی ہی نہیں بلکہ قرآن کا پیغام بھی اس حفاظت میں شامل ہے اور یہی پیغام علوم اسلامیہ کا جوہر ہے۔ اگر یہ بات یقینی ہے تو یہ امر بھی حتمی ہے کہ کچھ اہل علم اس کام پر تا قیامت مامور رہیں گے۔

یہ بھی ایک مسلمہ آفاقی حقیقت ہے کہ علم وفکر یا تجربہ ومہارت کے کسی میدان میں جب کوئی اعلیٰ کامیابی کی منزل حاصل ہوتی ہے تو اس کے نتائج وثمرات نیچے تک، معاشرہ کی ہر سطح پر پہنچتے ہیں۔ جیسا کہ طبی میدان میں غیر معمولی تجربات تو کچھ افراد ہی کرتے ہیں مگر ان کے ثمرات سے ایک عالم فیض یاب ہو جاتا ہے جس سے نہ صرف طبی مسائل کے حل میں مدد ملتی ہے بلکہ ایک عام شعور کی سطح بھی طبی معاملات میں بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ماحولیات کے شعبہ میں ماہرین کسی نئے تجربہ یا مشاہدہ تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے تحقیقی نتائج کے اثرات دوررس ہوتے ہیں اور عام انسانوں کا ماحولیاتی شعور بلندتر ہو جاتا ہے۔ علوم تجربی کا ہر شعبہ حتیٰ کہ ادب اور فنون لطیفہ کا میدان بھی اس بات کے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر گذشتہ دو دائروں کی ترقی، عروج اور مسلسل بہتری ہمیں منظور ہے تو اس تیسرے اور اہم

ترین دائرۂ عمل سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس آخری دائرہ کو ہمیں اپنا اصل مطمح نظر بنانا پڑے گا۔ ہمیں اپنی مکمل صلاحیتوں اور ممکنہ وسائل سے کام لے کر اسلامی تحقیق کے اعلیٰ معیارات تک پہنچنے اور نئی منزلوں تک رسائی حاصل کرنے کی مسلسل کاوش اور کوشش کرنی ہوگی۔

اگر بہت پیچھے جا کر اپنے اسلاف کو ہم نہ بھی دیکھیں تو کم از کم ماضی قریب میں اپنی گذشتہ ایک دونسلوں کے کارناموں کا جائزہ ہم ضرور لے سکتے ہیں اور یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان بزرگوں نے باوجود قلت وسائل کے کیا کیا کام کر لیے اور تحقیق کا کس قدر اعلیٰ معیار ہمارے سامنے رکھ گئے۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہماری اس پاک سرزمین میں گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران ایسی نابغۂ روزگار شخصیات ہمارے سامنے سے گزر کر چلی گئی ہیں اور ایسی ایسی منفرد ہستیاں اپنی عبقریت کا جلوہ دکھا گئی ہیں کہ وہ بھی اگر ہماری سوچوں میں بس جائیں اور ہم ان کے عطا کردہ پیمانوں سے آج اپنے کو پرکھنا شروع کر دیں تو ہم میں سے کتنوں کا پتہ پانی ہوجائے اور عرق انفعال کے قطرے ہم میں سے اکثر کو غسلِ ندامت سے گزار دیں۔ ہمارے اس ملک پاکستان میں ڈاکٹر حمید اللہؒ، سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید عبدالقدوس ہاشمیؒ، مولانا عبدالعزیز میمنیؒ کے علاوہ ہمارے مدارس سے وابستہ بزرگوں میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا سرفراز خان صفدرؒ جیسے علماء اور محققین میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ علم کا مینار اور نسلوں کا معمار تھا۔ ایسے درخشاں ستاروں کی موجودگی میں ہمارے پاس نہ مثالوں کی کمی ہے نہ نمونہ کا کوئی فقدان۔ بات صرف ہمارے ارادہ و دلچسپی کی ہے اور خلوص نیت اور عزیمت کی ہے۔ وسائل کی کمی کا ہم آج رونا نہیں رو سکتے کہ ان حضرات کے مقابلہ میں تو ہمارے ہاتھ میں پیسے کی ریل پیل اور وسائل کی بہتات ہے۔

آج اگر ضرورت ہے تو اس امر کی کہ ہم میں سے ہر ایک اپنا کڑا محاسبہ کرے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈال کر تلافیٔ مافات کرے۔ بالتحدید اس سلسلہ میں جس اقدام کی ضرورت ہے اس کا رخ ہم میں سے ہر ایک کا خود اپنی طرف ہی ہونا چاہیے اور اپنے عمومی رخ کو بدلتے ہوئے اپنے رویے بھی اس مقصد کی خاطر ہمیں فوراً بدل لینے چاہئیں۔ اس اقدام کے میری محدود نظر میں مندرجہ ذیل فوری اہداف ہونے چاہئیں:

۱۔ آئندہ ہمارے ذریعہ جن طلبہ یا اساتذہ کا انتخاب عمل میں آئے اس کا معیار مسابقتی قابلیت ہونا چاہیے گویا ہمیں کمیت سے کیفیت کی جانب آنا پڑے گا۔

۲۔ طلبہ کے ساتھ بطور معلّم ہمیں اپنے سابقہ رویہ کو یکسر بدلنا ہوگا اور اپنی اعلیٰ روایاتِ تعلیم و تربیت کا بھر پور احیاء کرنا ہوگا۔ ایک مدرس کا رابطہ اپنے طالب علموں سے ۲۴ گھنٹے کا ذہنی رابطہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ استاذ کا مقام وہی ہے جو باپ کا ہوتا ہے اور باپ کی شفقت مقررہ اوقات تک محدود نہیں رہ سکتی۔

ورنہ پھر مدرس ایک سرکاری ملازم تو ہوسکتا ہے مدرس نہیں ہوسکتا۔ نہ اس کے نصیب میں وہ برکات کبھی آ سکتی ہیں جو معلّم کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع استاذ کے حصہ میں خود بخود آتی ہیں۔ یہ کام بظاہر مشکل مگر درحقیقت بے حد آسان ہے۔ اس میں نہ اضافی بجٹ کی ضرورت ہے نہ کسی سرکاری منظوری پر یہ اقدام موقوف ہوسکتا ہے، محض نیت کرنے کی دیر ہے، اس نیت کے بدلتے ہی نتائج بدلتے نظر آئیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس فیصلہ کے بعد آپ کے مکتب سے جو برآمد ہوگا وہ علامۃ الدھر ہوگا بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو جو ہر قابل آپ کی تربیت پا کر نکلے گا وہ بقدر ظرف محروم واپس نہیں جائے گا بشرطیکہ نیت اس کی بھی طلب علم ہی ہو نہ کہ حصول سند برائے جلب مال وزر۔ یہ بات آج بھی مسلمات میں سے ہے کہ ساری ٹیکنالوجی ایک طرف اور استاد شاگرد کا تعلق وتعامل دوسری طرف اور اس پر بھاری ہے۔ ورنہ دنیا کی سب جامعات ومدارس سے استاد برطرف ہوتے اور کلاس روموں میں ایک ایک کمپیوٹر فی طالب علم مہیا کر کے بہت سا بجٹ بچا لیا جاتا۔

۳۔ ابتدائی قدم کے طور پر ہمارے درمیان خصوصی دلچسپی کے میدان تقسیم کر لیے جائیں اور باہم مشاورت سے ہم یہ طے کر لیں کہ فلاں جامعہ کے کلیہ علوم اسلامیہ کو مثلاً علوم القرآن کا مرکز کمال بنایا جائے گا، فلاں کو مرکز علوم السنۃ، مرکز علوم فقہ، مرکز سیرت وتاریخ، مرکز کلام وفلسفہ، فنون وآداب اور کسی ایک جامعہ میں خصوصی مرکز بعنوان: ''تحقیقات علوم اسلامیہ برصغیر میں'' ہو جائے۔ اس ابتدائی اساس کے قائم کرنے کے بعد دیگر شعبوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ رائج الوقت علوم انسانیہ کو اسلامی معیار علم سے پرکھا اور برتا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل اساس ہمیشہ قرآن وسنت اور ان کی روشنی سے پیدا ہونے والے علوم اسلامیہ کو حاصل رہے گی۔ مثال کے طور پر جب مارکسی نظریہ حیات کا زور تھا تو بعض ممالک میں علوم وافکار اور زندگی کے تمام تصورات وتخیلات کو مخصوص مارکسی نظریہ سے قبول اور رد کرنے کا عمل جاری ہوا۔ بالکل اسی طرح ہم طالبانِ اسلام کو یہ حق حاصل ہے اور بدرجہ اولیٰ اس کام کو انجام دینا ہماری ذمہ داری رہے گی کہ ہم بقول علامہ اقبالؒ ''جملہ علوم انسانیہ کی پیش رفت پر ناقدانہ نگاہ رکھیں'' اور ان افکار اور رویوں کو جو انسانی تہذیبوں میں رواج پا رہے ہیں اپنی کسوٹی پر پرکھ کر جو بات ہمارے مقاصد کے لیے اپنی افادیت ثابت کر دے اس کو قبول کر لیں اور باقی ہر چیز سے علی الاعلان برأت ظاہر کر دیں۔ اس تنقیدی مطالعہ سے ہمیں ایک طرف اپنے فکری نظام کو اپنی شرائط پر وسعت دینے کا موقع ملے گا اور دوسری جانب ہم ان بے شمار منتشر اور مفسدانہ رجحانات اور خیالات سے اپنے جسد ملی کو محفوظ کر لیں گے جن کا آج کل ذرائع ابلاغ پر سیلاب آ رہا ہے اور گھر گھر میں یہ سیلابِ بلا اپنی جگہ بنانے کی کوشش میں دن رات مصروف ہے۔ تیسرا فائدہ اس مطالعہ سے یہ ہوگا کہ ہمارے وہ مسلمان بھائی بہن جو مضر اجنبی خیالات کے زیر اثر آتے جا رہے ہیں، ان تک ہم اپنے اسلامی پیغام کو زیادہ موثر انداز میں پہنچا سکیں گے کیوں کہ ہم ان کی زبان میں ان سے بات کر سکیں گے اور ان کے سوالات کے جواب اطمینان بخش طریقہ پر فراہم کریں

گے۔

جب وہ مرحلہ آجائے گا کہ مجوزہ مراکز اپنے اپنے میدان عمل میں سرگرم ہوکر مفید نتائج سامنے لانے لگیں تو ہم ضروری تیاری کے ساتھ اس نام نہاد تہذیبی مکالمہ میں بھی داخل ہوسکتے ہیں جو آج ایسا دنگل بن گیا ہے جس میں ہمارے بھائی بند بغیر سوچے سمجھے داخل ہوتے رہتے ہیں اور فائدہ کی بجائے نقصان کما کر واپس آجاتے ہیں۔ بسا اوقات ہر طرح کے بے مقصد نزاع اٹھا کر اور بے سود بحث وجدال پر وقت اور وسائل کا ضیاع ہی کیا جاتا ہے۔ جس پر اکثر واثمھما اکبر من نفعھما کا گمان ہونے لگتا ہے۔

آخری بات جو یہ طالب علم آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ساری کاوش بے معنی اور ہر تدبیر صفر ہوکر رہ جائے گی اگر ہم ابتدائی مراحلِ تعلیم وتربیت ہی کے دوران اس قابل نہ ہوسکے کہ ان مستقبل کے علماء اسلام کے دلوں سے اغیار کا رعب یکسر نکال دیں۔ جو کلمہ پڑھ کر ہم اپنی زندگی کا پسندیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں اور ساری زندگی اس راہ پر چلتے ہوئے مرحلہ بہ مرحلہ کمال تحقیق کی آخری منزل تک رسائی چاہتے ہیں، وہ منزل ہمیں کیسے مل سکتی ہے اگر راہ منزل ہی کے درست ہونے کا پتہ نہ ہو؟ اس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا کہ جس نصب العین پر عین الیقین کی طرح بھروسہ اور اطمینان نہ ہو وہ بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے اور ہمیں کچھ کرنا دھرنا نہ پڑے۔ یقین کا بار بار کمزور پڑنا، راہ راہ پر قدم ڈگمگانا، کھیل تماشوں کے طفولی شوق میں نظروں کا کہیں نہ کہیں بہک جانا، دل ودماغ کا شیطانی طلسمات میں بار بار الجھنا عوام الناس کی حد تک تو فطری بات ہے جو اس عالم رنگ وبو سے ختم کبھی نہیں ہوسکتی لیکن جو لوگ اساتذہ کے مقام پر فائز ہیں ان سے کسی قدر عزیمت کی توقع بے جا نہیں۔ یہ حضرات اگر ان راستے کی رکاوٹوں کو چپ یا راست کرکے نکل جائیں تو پھر یہ رکاوٹیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ ایمان جو ہماری دل کی دولت اور ہر مسلمان کا اصل سرمایہ ہے اسے تو چھونے کی مجال کسی کو نہیں۔ اسی ایمان اور بندگی کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہی علم انسانی کو مستقل وجود بخشا گیا۔ اس طرح علم کا حصول اور اس کی رہبری میں ترقی وکمال تک پہنچنا ہمارے لیے مقامِ بندگی کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی، غرض بھی ہے اور غایت بھی، منشا بھی ہے اور مقصود بھی، اس لیے کہ ہمارا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، وہی ہمارا ملجا وماویٰ ہے، ہماری ہر امید اسی سے قائم اور سارے کا سارا بھروسہ اسی پر ہے۔ اسی ذاتِ واحد واَحد وصمد کے سہارے ہم کھڑے ہیں کہ وہی واحد معبود ہے اس لیے وہی ہمارا اصل مقصود ہے کہ وہی علی الاطلاق موجود بھی ہے۔

اگر آج ہم اپنی خواہشات اور ارادوں کو، محرکات اور نیتوں کو، اپنے اہداف وغایات اور اغراض ومقاصد کو اس مالک ومولیٰ کی مرضی سے ملا دیں اور 'مرضی مولی از ہمہ اولی' قال سے حال بن جائے تو ہماری کایا پلٹ سکتی ہے۔ اگر آج ہی سے ایسا ہوسکے کہ ہماری منزلِ مراد واقعتاً رضائے خدائے ذوالجلال بن

جائے تو خود سوچیے کہ ہمارے ادبار کو اقبال سے بدلنے میں کیا دیر لگ سکتی ہے؟ آج اگر ہمارے ملی افکار کے خزانوں میں، ہماری من کی دنیا اور خوابوں میں، ہمارے چھپے ہوئے سپنوں کی تنہائیوں میں، ہمارے تمدنی ذوق کی بلند پروازوں میں یہی ایک نغمہ لا الہ الا اللّٰہ گونجنے لگے تو کیا پھر بھی منظر نہیں بدلے گا؟ آج کثرت زاغ وزغن سے اٹے ہوئے، پرشور وشر قومی سیاست کے ایوانوں کے بجائے مراکزِ اختیار واقعتا خدائے واحد کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے سرنگوں ہو جائیں، ہرسو اگر یہی صدا بلند ہونے لگے تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟ یہ سب کچھ پل بھر میں بدل سکتا ہے: ألم یأن للذین آمنوا أن تخشع قلوبھم لذکر اللّٰہ؟

مگر ہو کیا رہا ہے؟ آبادیوں کے ایسے جنگل اُگ آئے ہیں جو بربادیوں کے چنگل میں محبوس ہیں، ہماری فکر وشعور کی دنیا میں آج کیا ناٹک ہو رہا ہے؟ ذرا سوچیے! ہو یہ رہا ہے کہ ہرسو ایک تہی دامن، قابض، مقبوضہ اور منقبض، نیم بشر آمادہ بشرّ ایک فکر غیر انسانی اور منہ زور جبلتِ حیوانی کا راج ہے۔ یہی فکر یا بے فکری ہمارے دل ودماغ، حواس اور جذبات پر مسلط ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ فکر بے شعور و بے سمت، بدراہ اور بدکار ہے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی عرصہ کے بعد جس تہذیبی قیادت کا ہم شکار ہوئے ہیں اور زیادہ تر بے خبری سے شکار ہو گئے ہیں وہ نام نہاد قیادت ہر لحاظ سے ذلت آمیز اور ضلالت آموز ہے۔ اس کا فکری مواد درآمد از جہالت براہ جہالت ہے اور مسلسل بسوئے جاہلاں رواں دواں ہے۔ اس تہذیبی یلغار کا نشانہ ہمارے جسد ملی کا ریشہ ریشہ اور رواں رواں ہے۔ اپنی اقدار، اپنی تہذیب وثقافت کی یہ مسلسل تباہی ہم ان حضرات کے ہاتھوں مسلسل دیکھ رہے ہیں جنہیں ہماری قومی ترقی اور ملی عروج کا نقیب بننا چاہیے تھا لیکن ہمارے یہ قائدین آتش نمرود، رقص بوجہل اور شرار بولہبی کے خیرہ کن نظاروں کی چکاچوند کے سامنے سپر انداز ہو کر مبہوت کھڑے ہیں۔ ان لوگوں کی عقلیں مسلوب ہو گئیں ہیں، ضمیر مصلوب ہو چکے ہیں اور پیران حرم صحن کلیسا میں مست نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف عوام کالأنعام ہیں جو مسلسل گھرے ہوتے اور پھیلتے اندھیروں میں غلطاں و پریشاں ہیں۔ کچھ 'معززین' نام نہاد روشن خیال مگر پست حوصلہ غلام ایسے ہم پر حاوی ہو گئے جو اس ہلاکت خیز قافلہ میں شامل ہو کر پردۂ محمل کی تلاش میں سرگرم اور سرگرداں ہیں۔ انہوں نے کبھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا کہ کہاں سے آئے تھے اور کدھر کو نکل گئے ہیں۔ انہوں نے بزعمِ خود اسی من پسند 'لیلیٰ' کے سایۂ عاطفت میں اپنا گوشۂ عافیت بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ طوفانِ نوح کی لہروں میں بھی مانندِ بہار مست ہیں، صرصرِ عاد اور صیحۂ ثمود بھی ان کو کانوں میں رس گھولتی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ مگر جس چیز کو یہ لوگ سفینۂ ثقافتِ جدید سمجھ کر اس پر سوار ہوئے ہیں وہ درحقیقت فرنگی لباس میں رنگ برنگا ایک قرنطینہ ہے۔ اس کو یہ لوگ سفینۂ نجات سمجھ کر دم بہ دم اس میں داخل ہو رہے ہیں اور دم بخود ہو کر اپنے کو اس ثقافتی قفس میں مقید کرنے کو بے تاب ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جوش وخروش سے اس قید کو بخوشی قبول بھی کر رہے ہیں۔ اس 'سفینۂ نجات' کے سواروں پر کرگسوں کا پہرہ ہے۔ ان کے ہر طرف

دوستوں کے رنگ میں دشمن گرگوں کے غول کے غول آراستہ ہیں اور یہ سب خواب گراں میں گہری نیند سوتے ہوئے سوئے بحر ظلمات رواں دواں ہیں۔ ان کی منزل شیاطین الانس والجن کی جانب سے ملنے والی موعودہ نقد ملنے والی 'جنت' ہے جس میں ان کو بافراط اور بلاحساب نعمت عاجلہ کی مسرتوں سے ہمکنار ہو جانے کی امید دلائی گئی ہے۔ گو ان نعمتوں کے خلود اور پائیداری کا کوئی بیمہ کفالت اس جدید سفینۂ نجات کے سواروں کو نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم یہاں غفلت کے قافلہ پر سوار ہو کر آنے والوں کو فوری لذتوں کا کچھ سامان ضرور مہیا کیا جاسکتا ہے۔ اس نعمت موعودہ کے حصول کی واحد ضمانت فرعونِ وقت اور قارونِ زماں لوگوں کی لن ترانیاں اور للکاریں ہیں جو اس کشتیٔ نجات کے سواروں کی ڈھارس بندھاتی رہتی ہیں۔ سفینۂ غفلت کے پشتیبان آلہۂ وقت اور اصنامِ تجدد ان مسافروں کی امیدوں کا مرکز اور آرزوؤں کا محور ہیں۔

اس پیش منظر اور پس منظر میں اب یہ فیصلہ ہمیں خود ہی کرنا ہے کہ اِدھر آتا ہے ہماری جبلت کا پروانہ یا اُدھر جاتا ہے۔ فیصلہ تو ہمیں کرنا ہے اور دو راستوں میں سے ایک ہی کا انتخاب کرنا ہے۔ ہمارے ارادہ اور اختیار کو دعوت دینے والے ان دو راستوں کے علاوہ تیسرا کوئی درمیانی راستہ ہمارے پاس ہے بھی نہیں۔ یہ ایک گھمبیر صورت حال ہے اور انتہائی اضطراب کی حالت ہے۔ ذرا ذہن پر زور ڈالیں اور بہ چشمِ بصیرت اگر ہم اپنے اندر اور باہر کو ٹٹولیں تو معاملہ کی سنگینی کا اندازہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

ہمیں نیک و بد سمجھانے والے، بار بار یاددہانی کرانے والے ہمارے سامنے عملی راہ ہدایت کے دروازے کھولنے والے رہبر اور رہنما ہمیں سمجھا کر کب کے جا چکے۔ وہ تو اپنی منزل مراد پا کر شاد آباد ہو کر اپنے اصلی مسکن میں جا کر بس چکے۔ ہمارے پاس آج نہ زیادہ وقت ہے نہ کئی متبادل راستے، یہ بات البتہ ضرور ہے کہ اگر کوئی دلجمعی اور یقین کامل کے ساتھ دوسرا متبادل اور دوررس راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اس کے سامنے کئی نئے امکانات کھل جاتے ہیں۔ اس کو ایک نیا عالمِ ایجاد و امکاں نظر آنے لگتا ہے جو حیرت و مسرت سے بھرپور ہے، امید کی روشنی سے منور ہے اور مایوسیوں کا یہاں کوئی گزر نہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کو ایک نئے دشتِ امکان کا راستہ نظر آجاتا ہے۔ حدودِ حواس اور قیودِ حیوانیت کے پردوں کو ہٹا دیں اور ادراک کی سرحدوں کے پار اتر جائیں تو ایک نئے کہکشانِ نور میں ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ عزم و ہمت، کاوشِ اخلاص اور عشقِ حقیقی کی مدد سے دم بھر میں پار اتر کے ہم ایک عالمِ خلود میں پہنچ سکتے ہیں۔ یوں ہم ایسے شبستان میں جا کر ان حلقۂ عاشقاں میں شامل ہو سکتے ہیں جنہوں نے ازل سے حمد باری کا سرمدی نغمہ گایا ہے اور مسلسل یہ نغمہ جاوداں وہاں سنائی دے رہا ہے اور اس عالم میں مسلسل یہ صدا بلند ہو رہی ہے۔ اس طرح انبیاء اور رسولوں کی دکھائی ہوئی شاہراہ ہمیں صاف اور سیدھی نظر آسکتی ہے بشرطیکہ ہم ادھر دیکھنا چاہتے بھی ہوں اور اندھیروں میں بھٹکنے کی بجائے واقعتاً ہمیں سچائی اور روشنی کی سچی

تلاش ہو، پھر ہم بہ آسانی اپنے ایک فیصلہ سے امید اور کامیابی کے ساحل امان پر اتر سکتے ہیں۔ اس راہ پر سفر کا عزم اور کوشش کرنے والوں کا اصل انعام یہ ہوتا ہے کہ وہ بالآخر جملہ صفاتِ جلال و جمال و کمال سے مالا مال وصال کے منتظر اپنے محبوب حقیقی کے دربار میں حاضر ہو سکتے ہیں اور اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کے قرب کی لذت حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر اس راہ کی خوبی یہ بھی ہے کہ باوجود ہر ننگ و عار کے اور عمر بھر کے گناہوں کے بار کے محض اس خالق و مالک کے حضور جھک کر اس ذات وحدہ لاشریک کی نافرمانی کو ترک کرتے ہوئے اس کے سامنے اظہار ندامت کر کے بذریعہ توبہ اس محبوب حقیقی کا قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نصب العین کے حصول کی واحد شرط یا قیمت حب الٰہی ہے جس کا چراغ جونہی جلتا ہے دلوں میں فوراً اجالا ہونے لگتا ہے بشرطیکہ ہم بھی اپنی محبت میں کھرے اور سچے ہوں اور اس پر قائم رہیں۔ یہ ایسی محبت ہے جو دنیا کی ہر چیز کی نفی کرنے کا یا اسے ترک کرنے کا مطالبہ ہم سے نہیں کرتی۔ اس محبت الٰہی کا تقاضا ہم سے صرف یہ ہے کہ ہم اس محبتِ حقیقی یا عشقِ حقیقی کو دنیا کی ہر چیز پر حاوی اور غالب کر سکیں۔ محض اتنی قیمت ادا کر کے ہم فلاحِ دنیا اور سعادتِ عقبیٰ کی انمول دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اک حیاتِ جاوداں اور اس کی ابدی مسرتوں کے مقابلہ میں یہ قیمت ہرگز زیادہ نہیں ہے۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس صاف شفاف علم نافع کے چشمۂ جاری سے مسلسل فیض یاب فرمائے۔ علوم اسلامیہ کی جو بے بہا دولت ہمیں عطا کی گئی ہے ہمیں اس کی قدر و قیمت کی صحیح پہچان نصیب ہو اور اس دولت کو عروج و ترقی دینے کے عظیم الشان مقصد میں ہم اپنے کو کھپا دیں۔ ہماری ہر بھول چوک، غلطی، غفلت اور انحراف کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں اور ہمیں اپنے اولیں دشمن اور آخری حریف ابلیس کی ریشہ دوانیوں اور چشم بازیوں سے بچا کر اپنی حقیقی منزل، یعنی جنت رضوان میں پہنچا دیں تا کہ ہم بالآخر اپنے آبائی گھر، ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے مسکن یعنی جنت میں پہنچ کر مکمل سکون پا جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مقرّ حقیقی کے علاوہ آدمی کہیں سکون پا نہیں سکتا۔ اس فانی دنیا کے تمام وسائل پر قابض ہو کر بھی مکمل خوشی کسی انسان کا مقدر کبھی نہیں بن سکتی۔ اس ایمان اور یقین کو دل و دماغ میں پختہ اور راسخ کئے بغیر اسلامی تحقیق تو کجا، خود ہماری نجات ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں یقین کامل عطا فرمائے، ہر قسم کے انحرافات اور غفلتوں کے پردوں کو ہمارے دل و دماغ سے ہٹا دے اس طرح کہ ہم سراب کاذب کے سحر سے آزاد ہوں اور عشق حقیقی کی شراب صافی ہمیں نصیب ہو۔

دین کا میدان چاہے وہ علم کا ہو یا عمل کا۔ ایک بے حد سنجیدہ سوچ اور دور رس فیصلہ کا ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ آج اگر ہم نے یہ درست فیصلہ نہ کیا تو پھر کسی اسلامی تعلیم و تحقیق سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر یقین

سے کوئی شخص خالی رہ جائے یا یہ یقین ایسا ہو کہ اس پر شکوک غالب آ جائیں، یا زبان سے ہم یقین کامل کا اعلان کرتے رہیں مگر ہمارا دل اور دماغ ابلیس وطاغوت کے پسندیدہ نظریات اور رویوں سے مرعوب ہوتا رہے تو پھر ایسے حضرات کی جگہ اسلامی تحقیق کی دنیا میں نہیں، انہیں کوئی اور مشغولیت تلاش کر لینی چاہیے۔

تعلیم و تربیت ڈاکٹر محمد امین

یونیورسٹیوں میں اسلامی تحقیق

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی وعلوم اسلامیہ نے 9, 10 جنوری 2013ء کو دو روزہ ورکشاپ منعقد کی جس کا مرکزی موضوع اسلامی علوم میں تحقیقی مناہج کی یکسانیت تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب (پروفیسر علوم اسلامیہ اور وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) نے اسلامی ریسرچ میں رٹے رٹائے موضوعات سے ہٹ کر زندہ موضوعات پر تحقیق پر زور دیا اور اس ضمن میں ماہنامہ البرہان کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ راقم نے اس کانفرنس میں اسلامی علوم کی تدریس و تحقیق کو معیاری بنانے کے لیے جو تجاویز پیش کیں ان میں سے چند اہم، اختصار کے ساتھ، یہاں درج کی جا رہی ہیں:

۱۔ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ اور ان کے سارے پروفیسر زمل کر ایک ملک گیر کونسل بنائیں تا کہ علوم اسلامیہ کی معیاری تدریس و تحقیق کے لیے اجتماعی کوششیں بروئے کار لائی جا سکیں۔

۲۔ مسلم معاشرے کو جو مسائل آج درپیش ہیں ان کی اکثریت مغربی فکر وتہذیب کے مسلم معاشرے پر اثرات کا نتیجہ ہے لہٰذا یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کی تفہیم اور اس کے تنقیدی اور اسلام سے تقابلی مطالعہ کو نہ صرف شامل نصاب کریں بلکہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے موضوعات کے انتخاب کے وقت بھی انہی کو نمایاں جگہ دی جائے۔

۳۔ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کے فضلاء کی اکثریت رسوخ فی العلم سے محروم ہوتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ طلبہ کو عربی زبان میں مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح اکثر طلبہ انگریزی میں دسترس نہیں رکھتے۔ لہٰذا بنیادی زبانوں میں مہارت ضروری ہے تا کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے سطحی نہ ہوں اور طلبہ اصل مآخذ سے رجوع کرنے کے قابل ہوں۔

۴۔ عمومی اور مغربی طرق تحقیق (یعنی Qualitative and Quantitative Research) کے علاوہ 'اسلامی طرق تحقیق' کا ایک الگ مضمون ہونا چاہیے تا کہ طلبہ تحقیق کے اسلامی اسالیب سے واقف ہو سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔

۵۔ تحقیق میں تخلیقیت اور اصالت (Originality) کو مدنظر رکھا جائے اور نئے آئیڈیاز پیش کیے جائیں۔ رٹے پٹے موضوعات پر محض جمع معلومات (Mechanical Research) کے کام پر تحقیق کی ڈگری نہ دی جائے۔

۶۔ جدید تعلیمی اداروں کے نصابات مؤثر اسلامی تعلیم وتربیت سے محروم ہیں اور دینی مدارس 'دینی تعلیم'

کے نام پر اپنے طلبہ کو عصری علوم سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سیکولرزم اور تعلیمی ثنویت غیر اسلامی ہے لہٰذا وحدت تعلیم کے تصور پر، قرآن وسنت کی روشنی میں اور منہج سلف کے مطابق نہ صرف علوم اسلامیہ کے موجودہ نصابات پر نظر ثانی کی جائے بلکہ عمرانی علوم کی بھی اسلامی تناظر میں تدوین نو کی جائے۔ علوم اور نصابات کی مذکورہ تناظر میں اسلامی تشکیل نو بھی یونیورسٹی سطح پر تحقیق کا اہم جزو ہونی چاہیے۔

تعلیم و تربیت ڈاکٹر محمد امین

پنجاب میں تعلیم کی تباہی

اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے اور قوم کی اخلاقی و مادی ترقی میں یہ کیا کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں تعلیم کی کثرت مطلوب ہے وہاں اس کی نظریاتی سمت کا درست ہونا بھی ناگزیر ہے کیونکہ تعلیم درحقیقت آدمی بناتی ہے اور انسان سازی کا یہ کام اگر ان آئیڈیلز کے مطابق نہ ہو جن پر معاشرہ یقین رکھتا ہے تو ایمانی اور نظریاتی کشمکش کی وجہ سے شخصیت تباہ ہو جاتی ہے اور صاحب کردار افراد پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ سارے شعبۂ ہائے زندگی کو اسلامی اصولوں پر از سر نو استوار کیا جاتا اور تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اسلامی تشکیل نو کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی لیکن افسوس کہ اس سمت میں کوئی خاص کام نہ ہوا اور عوام اور اسلامی جماعتوں کے دباؤ پر کچھ ہلکے پھلکے نمائشی اقدامات کر دینے کو کافی سمجھا گیا۔

ایک طرف یہ حالت تھی تو دوسری طرف مغربی فکر و تہذیب کی علمبردار اقوام ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھی تھیں بلکہ اپنے تہذیبی تصورات اور نظریات کو دنیا بھر میں پھیلانے اور غالب کرنے کے

تبدیلئ ایڈریس

تحریک اصلاح تعلیم اور اس کے مختلف شعبوں کے دفاتر ۱۷ اے فیصل ٹاؤن لاہور سے ۶۹ ۳ بی فیصل ٹاؤن، لاہور منتقل ہو گئے ہیں۔

فون: 042-3516 9469 موبائل: 0300-460 9522

ویب: www.safa.edu.pk ای میل: info@safa.edu.pk

لیے کوشاں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلم ممالک میں اپنے مقامی گماشتوں کی مدد سے دوسرے بہت سے شعبوں کی طرف تعلیم کو بھی اپنی آماجگاہ بنالیا اور تعلیم کو مغربیت (Westernization) اور سیکولرائزیشن (Secularization) کی راہ پر ڈال دیا۔

پنجاب کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ سندھ کے قوم پرست، بلوچی اور پختون خواہ جب علاقائیت کے نعرے لگاتے تھے اور پاکستان کی نظریاتی شناخت جب بگڑتی نظر آتی تھی تو پنجاب کو دیکھ کر حوصلہ ہوتا تھا کہ وہ بہرحال پاکستانیت کا علمبردار تھا لیکن آج ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیمی بگاڑ میں پنجاب سارے صوبوں سے آگے نکل گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب اچھے ایڈمنسٹریٹر ہوں گے لیکن پنجاب میں تعلیم کی نظریاتی شناخت تباہ کرنے میں جو اندوہناک کردار وہ ادا کر رہے ہیں وہ انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اندر سے اتنے سیکولر ہوں گے۔ انہوں نے تعلیم میں دو غیر مسلم، غیر ملکی مشیر رکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک امریکی ہے اور دوسرا برطانوی۔ وہ دونوں مل کر پنجاب میں تعلیم کا قبلہ مکہ سے بدل کر واشنگٹن بنانے کے لیے جو اقدامات بھی تجویز کرتے ہیں محترم میاں صاحب آنکھیں بند کر کے اس پر صاد کرتے جا رہے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں دھونس سے صوبے میں نافذ کرتے جا رہے ہیں۔ سکولوں میں اردو میڈیم پر پابندی لگا دی گئی ہے اور پہلی جماعت سے بلکہ پریپ سے انگریزی میڈیم کو زبردستی رائج کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ تعلیم کو سکول سطح پر مخلوط بنا دیا گیا ہے، طلبہ کی سطح پر بھی اور اساتذہ کی سطح پر بھی۔ نصاب سے قرآنی آیات، سیرت اور سوانح کا حصہ کم کر کے غیر مؤثر بنا دیا گیا ہے۔ بعض حکومتی اداروں میں اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کا امتحان ہی نہیں لیا جاتا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں کنسرٹ اور میوزیکل شوز کے ذریعے ناچ گانے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

انگریزی استعمار نے جو پالیسی لارڈ میکالے کے ذریعے 1832ء میں بنوائی تھی کہ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو مسلمانوں کو نامسلمان بنا دے اور مغربی فکر و تہذیب کا خوگر بنا دے تاکہ وہ استعمار کی مزاحمت نہ کریں۔ اس پالیسی پر زور حال ہی میں امریکہ کے 9/11 کمشن نے دیا تھا اور اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری آج بھی ایک برطانوی گورڈن براؤن (سابق وزیر اعظم) کو سونپی گئی ہے جس کے نمائندے لاہور میں بیٹھ کر پنجاب کی تعلیم کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو نامسلمان اور انہیں مغربی

فکر وتہذیب کا ذہنی غلام بنانے کے علاوہ ان پالیسیوں کا فوری اور نقد نقصان یہ ہوگا کہ زیادہ بچے فیل ہوکر سکول چھوڑیں گے، شرح خواندگی مزید کم ہوگی۔ حیا اور عفت جیسی اقدار ختم ہوں گی اور بے حیائی اور فحاشی پروان چڑھے گی۔ کوئی ہے جو میاں شہباز شریف صاحب سے پوچھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کے کیا نتائج نکلیں گے؟

اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی ــ ڈائیلاگ

محمد رشید ☆

سائنس کی مخالفت ـــ کارِ بے ثمر (آخری قسط)

سائنس ــ ایک گدھا: سائنس کی مثال ایک سواری کی سی ہے کہ آدمی اس پر سوار ہوتا ہے اور اس سے فائدے اٹھاتا ہے۔

سائنس کا مقصود: سائنس اور اس کی ایجادات و دریافتوں کا اول و آخر اگر کوئی مقصود یا افادیت ہوسکتی ہے تو وہ انسان کی خدمت ہے یعنی انسان کا اپنی روزمرہ زندگی کو ضرر وعسر (نقصان وتکلیف) سے بچا کر فلاح و یسر (بہتری و آسانی) سے ہمکنار کرنے کے لیے ''سائنس'' کو بطور خدمت گار کے طور پر اختیار کرنا۔ یہ ایک متوازن طرز عمل ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ انیسویں اور بیسوی صدیوں میں جب سائنس کے میدان میں کچھ اس قسم کی حیرت انگیز دریافتیں اور ایجادات وقوع پذیر ہوئیں، تو اس وقت آسمانی وحی کی نمائندہ امت بدترین داخلی زوال کا شکار ہوکر سائنس کی علمبردار مغربی اقوام کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی۔ ندامت کا بدترین پہلو یہ ہے کہ یہ غلامی محض جسم کی غلامی نہیں تھی بلکہ امت مسلمہ کی عظیم اکثریت مغرب کی ذہنی غلامی کے بدترین حادثہ سے دوچار ہوچکی تھی۔ مغرب کا عیار اور مذہب دشمن فلسفی

عقل وفکر کی ساری قوتوں کے ساتھ سائنس و مذہب کو باہم تصادم کی راہ پر ڈالنے میں مصروف کار تھا۔ اسی شیطانی سوچ کی حکمرانی ہی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں پہلی دفعہ انسان کی اجتماعی زندگی سے مذہب کی عمل داری کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور پوری دنیا نے اس شیطانی فکر پر مبنی اعلان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ مذہب، جسے انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ ہی قوموں اور امتوں کے لیے وجہ افتخار و باعث عزت چیز سمجھا جاتا تھا، اس شیطانی سوچ کے غلبہ کی وجہ سے مذہب کو رفتہ رفتہ ایک باعث عار و وجہ تذلیل چیز سمجھا جانے لگا۔ نتیجتاً انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا اور بھیانک خلا یعنی مذہب کی تعظیم اور 'مذہبی تسکین' کا خلا پیدا ہو گیا۔ مشرق و مغرب کے شاطر و شیطانی دماغوں نے ''سائنس کی تعظیم'' کے مصنوعی اور مشینی طریقہ سے اس بھیانک خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا اپنے اس شیطانی اور اندھے منصوبہ کو کامیاب کرنے کے لیے مغرب کے مقتدر شیطانی دماغ نے نام نہاد سائنسی مابعد الطبیعیات کا عقیدہ گھڑا اور اس کی حمایت پر اپنے تمام سماجی علوم کو لگا دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سائنس جس کی حیثیت فقط اتنی تھی کہ وہ انسان کی زندگی میں ایک تابعدار معاون اور وفادار خدمت گار کے طور پر اپنے فرائض سر انجام دے، اسے اٹھا کر بذات

☆ شاہ فیصل کالونی، ملتان

خود مخدوم، مسجود اور قابل تعظیم و قابل احترام مقام پر بٹھا دیا گیا۔ سوچ کی یہ وہ بنیادی اور مہلک تبدیلی تھی جس نے آنے والے دنوں میں انسانیت کو نہ ختم ہونے والے مصائب اور آلام سے دوچار کر دیا۔

نام نہاد سائنسی تہذیب کا ماحاصل: کلیسا اور مذہب کی ناروا پابندیوں اور خونخوار جبر سے تنگ آ کر مغربی انسان نے جس نئے سائنسی و تمدنی اور بظاہر پرامن معاشرے کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی، اس کوشش کو آغاز ہی میں چند شیطانی دماغوں نے اچک لیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان مقتدر دماغوں نے اس نئے تشکیل پانے والے سائنسی و تمدنی معاشرے کی بنیادوں ہی میں عالمگیر فساد اور ہولناک خون خرابے کا بیج رکھ دیا۔ وہ اس طرح کہ جیسے ہی یورپ میں مشینی ایجادات اور سائنسی اکتشافات کو تیزی حاصل ہوئی پورا مغرب اپنی مشینوں اور اسلحہ سے لیس ہو کر اپنے اردگرد کی کمزور اقوام پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی تمام کمزور اقوام کو (جن میں سے اکثریت مسلم ممالک کی تھی) اس نے اپنا غلام بنایا، ان کے وسائل کو بے دریغ لوٹا اور بظاہر امن اور تہذیب کے نام پر بحر و بر میں ایک عظیم فساد برپا کر دیا۔ انہی ادوار میں جدید سائنسی و تمدنی دنیا کی نمبر ایک عالمی سپر طاقت امریکہ کی تشکیل و تعمیر کا مرحلہ سامنے آتا ہے تو کروڑوں کالے امریکیوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دیا جاتا ہے، انہیں جانوروں کی طرح

زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے اور مویشیوں و جانوروں کی طرح ہی ان کا اپنی نئی دنیا کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔سائنس و سائنسی مابعد الطبیعیات کی حامل جدید متمدن اقوام انسانیت سوزی اور اسلام کشی کے اس پہلے مرحلے سے تھک کر جب ذرا فارغ ہوتی ہیں تو بدترین درندوں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح آپس میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں جدید متمدن اور سائنسی دور میں ایک ہی صدی میں ان نام نہاد متمدن اقوام میں تاریخ انسانی کی دو عالمگیر جنگیں رونما ہوتی ہیں اور کروڑوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

قدیم جاہلیت سے جدید جاہلیت کی طرف منتقلی: مذہب کو اجتماعی زندگی سے نکال کر سائنس وجدید مابعدالطبیعیاتی تصورات (جدید جاہلیت) کی بنیاد پر جدید ریاست کی تشکیل بظاہر اس خوبصورت مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کی گئی کہ اس طرح انسانی معاشرے کو 'مذہب' کی وحشت اور اس کی بنیاد پر ہونے والے بدترین جبر وتشدد اور موت کے بھیانک کھیل سے بچا کر امن و آشتی سے ہمکنار کرنا ممکن ہو جائے گا۔لیکن درج بالا سطور میں بیان کی گئی صورتحال ثابت کرتی ہے کہ اس (جدید جاہلیت پر مبنی نام نہاد سائنسی مابعد الطبیعیات کے) فلسفہ پر عمل پیرا ہونے والی اقوام نے اپنی بنیادوں، اپنے مرحلۂ تعمیر اور اپنے انتہائی عروج غرض ہر ہر مرحلہ پر اپنے عمل سے اس فلسفۂ زندگی کو ایک ناکام فلسفہ ثابت کر دیا۔نوع انسانی من حیث المجموع ہزاروں سال تک مذہب کی منحرف، مسخ شدہ اور مشرکانہ تعبیرات کی پیروی کے نتیجے میں جس بھیانک فساد اور خون خرابے سے ہمکنار رہی، اور بالآخر انسان کا اجتماعی ذہن مذہب کی ان منحرف، مسخ شدہ اور مشرکانہ و باطل تعبیرات سے شدید بیزار و متنفر ہو گیا اور اس نے اس صورت حال سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ بہترین وقت تھا جب اسلام کے پیروکار آگے بڑھ کر اسلام کی امن وسلامتی اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا بہترین عقلی،علمی، اخلاقی اور قانونی نسخہ انسانیت کے اس فیصلہ کن موڑ پر ان کے سامنے رکھ دیتے۔لیکن اسلام اس وقت خانقاہوں یا پھر زیادہ سے زیادہ مساجد تک محصور ہو چکا تھا جبکہ مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور دعوتی زندگی کھنڈرات میں بدل کر عبرت کا نشان پیش کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نازک وقت میں جبکہ انسانیت کے کندھے پرانی جاہلیت (یعنی مذہب کی منحرف اور مسخ شدہ تعبیرات) کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک گئے اور انہوں نے اسے اٹھا کر اجتماعی زندگی سے نکال باہر پھینکنے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں کے داخلی زوال اور معاشرتی وسیاسی بگاڑ کی مکروہ تصویر کو مغرب کے شاطر و شیطانی مقتدر طبقہ نے زیادہ بھیانک کر کے دکھایا اور انسانیت کے کندھوں پر جدید جاہلیت (سائنٹزم، سیکولرازم، ہیومنزم وغیرہ) کا بوجھ لاد دیا۔

ذہنی غلامی: چنانچہ ایسے بدترین حالات میں جب کہ یورپ مشینوں پر سوار ہو کر مشرق کی اقدار کو

روندنے پر تلا ہوا تھا، اس کا اصل مقصود اسلام کی پاکیزہ اقدار کی جگہ اپنی ناپاک اقدار کو غالب و رائج کرنا تھا۔ مسلمانوں کی وابستگی اگر اسلام کی پاکیزہ اقدار سے انمٹ اور غیر مبدل ہوتی تو مسلمانوں کے لیے یہ بہت آسان ہوتا کہ وہ یورپ کی انہی مشینوں کے ذریعے سے مغرب کی ناپاک اقدار کو زمین کی گہرائیوں میں دفن کر دیتے جس طرح کہ اسلام کے آغاز میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سلطنت روما وایران کی حیوانی اقدار کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں کی ایک طرف اسلام کی پاکیزہ اقدار سے وفاداری اور وابستگی اس حد تک کمزور ہو چکی تھی، اور وہ اخلاقی و ایمانی لحاظ سے اس حد تک قحط اور بدحالی کا شکار ہو چکے تھے، کہ انہیں انسانی افکار کے کوڑے دان میں پڑی ہوئی کوئی بھی چمکیلی اور بظاہر اچھے رنگ و روغن والی چیز متاثر کر سکتی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بہت جلد مغرب کی مشینوں سے خوفزدہ ہو کر پہلے مغرب کی جسمانی غلامی کا شکار ہوئے تو اس جسمانی غلامی کے بعد ان کے اخلاقی و ایمانی لحاظ سے قحط زدہ قلوب و اذہان نے چاروناچار مغرب کے افکار (سائنٹسزم وغیرہ) کے آگے بھی ہتھیار ڈالنے ہی میں عافیت محسوس کی۔ اس اندوہناک صورتحال کی تصویر کشی علامہ محمد اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

مغرب کا عالم اسلام سے مطالبہ: مغرب کا رویہ عالم اسلام کے ساتھ یہ رہا ہے کہ وہ سائنسی ترقیوں پر سوار ہو کر ایمانی و مادی لحاظ سے بدحال و کمزور مسلم اقوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر انہوں نے سائنسی ترقیوں سے فائدہ اٹھانا ہے تو پھر وہ ان نام نہاد سائنسی اقدار (سائنٹسزم، سیکولرزم و ہیومنزم وغیرہ جن کا درحقیقت سائنس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے) کو بطور عقیدہ اور کلچر کے قبول کر لے بصورت دیگر مغرب مسلمانوں کو سائنسی ایجادات و ٹیکنالوجی سے استفادے کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔ اگر مسلمان سائنس کو ہتھیار بنا کر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا کام لینا چاہتے ہیں تو مغرب انہیں بدترین حالات سے دوچار کر دینے پر آمادہ نظر آتا ہے، اور جہاں جہاں اس کا بس چلتا ہے وہ ایسا کر گزرتا ہے۔ عراق پر کیمیائی ہتھیاروں اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے جعلی الزام کے نتیجے میں اسے بدترین تباہی و بربادی سے دوچار کرنا، پاکستان کو اٹامک انرجی کے شعبے میں خود کفالت حاصل کرنے کی راہ پر ڈالنے والے حکمرانوں کو بدترین انجام سے دوچار کرنا وغیرہ نمونے کی چند مثالیں ہیں۔ مغرب کے انسان کو قدیم جاہلیت (پال ازم، پاپائیت و کلیسائی سلطنت) کے نشے سے نجات ملی تو شیطان اور شیطانی آلہ کاروں نے نہایت مکاری سے اسے جدید جاہلیت کے نشے میں مدہوش کر دیا۔ اس نشے میں مدہوش اقوام کے مقتدر حکمرانوں و سائنسی فلسفیوں نے سائنس اور سائنسی ایجادات کو ان کا مخدوم و مسجود اور مقدس و محترم

معبود بنا کر رکھ دیا۔ اور عالم مغرب کی حالت اس قرآنی آیت کے مصداق ہوگئی جس میں بتایا گیا ہے کہ ''بھلا تو نے اس شخص کا حال دیکھا جس نے اپنے نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے''۔

سائنس پر جعلسازی سے ناجائز قبضہ: سائنس کے عنوان سے اپنے نفس کی پرستش میں مبتلا عالم مغرب مسلم سائنسدانوں کی کم وبیش چھ سو سالوں پر محیط سائنسی تحقیق و ریسرچ سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے باوجود سائنسی ارتقاء میں ان کا نام حرف باطل کی طرح مٹانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنی نام نہاد ملحدانہ سائنٹسزم کو سائنس کی بنیاد ثابت کر سکے اور اس طرح سائنس پر دجالیت اور شیطانیت کے ناپاک و ناجائز قبضے کو قانونی جواز مہیا کرنے کی جعلسازی میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ یہی مغرب مسلمانوں کو یہ حق دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے کہ وہ اپنے عقیدے، اپنے ایمان اور اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے سائنس اور سائنسی ایجادات کو ایک معاون و خدمت گار کے طور پر استعمال کریں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اور اپنے رویے سے بار بار اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اسلامی معتقدات پر قائم رہتے ہوئے اور قرآن وسنت پر عمل پیرا ہو کر سائنس کو بطور آلہ کار، معاون اور خدمت گار کے طور پر استعمال کر کے مسلمان درحقیقت سائنس کی توہین کر رہے ہیں۔ عالم مغرب سائنس کی توہین کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں چنانچہ اسی کی بدترین سزا وہ مسلم معاشروں اور ان کے راسخ العقیدہ افراد کو دے رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغرب کے لیے ایک راسخ العقیدہ مسلمان سائنسدان، سنت پر عمل پیرا انجینئر وڈاکٹر اور قرآن واسلام سے گہرا قلبی وذہنی لگاؤ رکھنی والی ہارورڈ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عافیہ صدیقی کسی صورت قابل برداشت نہیں۔ اسلام کو بطور سوار اور سائنس کو بطور سواری استعمال کرنے کے تصور ہی سے مغرب کے شیطانی دماغوں پر جنون اور ہیجان طاری ہوجاتا ہے اور وہ ہر اس شخص کو دنیا سے نیست ونابود کر دینا چاہتا ہے جو ''اسلام کو بطور سوار اور سائنس کو بطور سواری'' کے الحاد شکن تصور کی عملی مثال اور عملی نمائندہ بن کر بالفعل شیاطین مغرب کے اس فسوں اور جادو کے لیے موت کا پیغام بننے کی کوشش کرتا ہے۔ جسے مغرب کے شیطانی دماغ چار سو سالوں سے اسلام اور انسانیت کے خلاف بطور کارگر ہتھیار کے استعمال کرتے آرہے تھے۔

مغرب کے مقتدر ابلیسی اذہان کا طبقہ سائنس کے صرف اس استعمال کو برداشت کرتا ہے جو دنیا میں گمراہی، بے راہ روی، فحاشی، عریانی اور سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا باعث بن سکے۔ خاص طور پر مسلم معاشروں پر اس کی نگاہ نہایت گہری ہے اور مغربی اقدار سے آزاد رہ کر سائنس کے خالص انسانی بہبود کے لیے استعمال کو کسی صورت برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔

کرنے کا اصل کام: حالات کا یہ وہ اندوہناک منظر نامہ ہے، جو اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے والے افراد قرآن وسنت کے خالص سرچشموں سے سیراب ہو کر اور اپنے قول و عمل کی مکمل ہم آہنگی سے اس یک نکاتی ایجنڈا پر متفق و متحد ہو جائیں کہ وہ مسلمانوں میں ایمان کی آبیاری، اخلاق کی بلندی، دینی اقدار کے احیا اور معاشرتی سدھار کی ایک عمومی تحریک پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کر دیں۔ یہ اصل کام کرنے کی بجائے، ان میں سے ایک طبقہ اٹھتا ہے اور وہ سائنس پر گولہ باری شروع کر دیتا ہے، اور سائنس ہی کو ساری خرابیوں کی جڑ اور وجہ قرار دیتا ہے۔ اپنے اس بے معنی رویہ میں وہ اس حد تک ہیجان کا شکار ہوتا ہے کہ وہ ان تمام مصلحین، مفکرین اور اہل علم کو تضحیک اور طعنہ زنی کا نشانہ بنانے سے بھی نہیں رکتا جو ''اسلام کو زندگی کا راکب (شاہ سوار) اور سائنس کو مرکب (سواری)'' بنانے کے معتدل ومتوازن تصور کا حامل ہے۔ یہ طبقہ اپنے اس سائنس مخالف رویہ اور فکر کی ٹرانسمشن کے لیے اسلام اور اقدار سے محبت کو بطور ڈھال استعمال کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ طبقہ اسلام اور مسلمانوں کا وقت اور انرجی برباد کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر رہا ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے سائنس مخالفین کا یہ طرز عمل مغرب کے مقتدر شیطانی دماغوں کے ابلیسی دعووں (سائنس اور الحاد لازم وملزوم) کی نہ صرف تائید کر رہا ہے بلکہ انسانیت کی تباہی کے ابلیسی پروگرام کو طول دینے میں ایک معاون کا کردار ادا کر رہا ہے۔

سائنس — ایک گدھا: ہم اپنی معروضات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرنا چاہیں گے کہ سائنس کی عظمت کے ہم کبھی بھی قائل نہیں رہے۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہمیں کسی وقت سائنس کی حمایت میں بھی کچھ لکھنا پڑے گا۔ ہاں! ہم کردار کی عظمت، اخلاق کی بلندی اور ایمان کی بے پناہ قوت کو دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے برتر سمجھتے ہیں۔ یہ سماج کی روح ہے اور علم کا ماحاصل و مقصود ہے۔ یہ مضمون تحریر کرنے کا مقصد بھی سائنس کی تعریف و عظمت کے احمقانہ گیت گانا قطعاً نہیں بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ جس طرح گدھے پر سوار ہونا کفر نہیں بالکل اسی طرح ''سائنس'' پر سوار ہونا بھی کفر نہیں ہے۔ عالم مغرب کا قصور یہ ہے کہ وہ اسی ''گدھے'' اور اس کے تمام متعلقات و لوازمات کو قابل تعظیم، مقدس، محترم حتیٰ کہ معبود بنا بیٹھے ہیں اور مسلمانوں سے بھی اسی رویہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اب درست رویہ تو یہ ہے کہ مسلمان اس ''گدھے'' کو اپنے سروں اور کندھوں سوار کرنے سے انکار کر دیں بلکہ مسلمان رہتے ہوئے، ایمان، اخلاق اور اسلامی اقدار سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے اس ''گدھے'' کی سواری کے خوب خوب مزے لیں کیونکہ دنیا کی نعمتوں کو وجود میں لانے کا اصل مقصود تو یہ تھا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار مستفید ہوں۔ اب المیہ یہ ہوا ہے کہ عالم اسلام میں ایک طرف تو فکری و ایمانی لحاظ سے قلاش وہ طبقہ ہے جو اس 'گدھے' اور اس کے تمام تر متعلقات و لوازمات کی عظمت، تقدیس اور تسبیح میں دن رات مصروف عمل ہے — نہ وہ اس 'گدھے' پر

خودسواری کرتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو سوار ہونے دیتا ہے(کیونکہ نہ ہی یہ ایمان وتقویٰ کے ماحول کو اور نہ ہی انسانی مسائل کے حل کے لیے تحقیق وسوچ کے سائنسی ماحول کو پروان چڑھنے دیتا ہے) جبکہ اس کے برعکس اس ذہنی قلاش طبقہ کے ردعمل میں ایک دوسرا طبقہ اٹھتا ہے اور وہ اس ''گدھے'' پر کفر کے فتوے لگا کر اس کی سواری ہی کو سرے سے کفر اور حرام ہونے کا فتویٰ دے دیتا ہے اور 'گدھے' کی نسل ہی کے خاتمہ کا مطالبہ کر دیتا ہے۔

اس تنازعہ میں ہمارا کردار صرف یہ ہے کہ ہم نے اس 'گدھے' کی شرعی وعقلی حیثیت کی تفہیم کی کوشش کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔اگر 'گدھے' کی اس تفہیم میں ہمارے دلائل درست ہیں تو ہمارا مدعا حاصل ہو گیا، اور اگر ہمارے دلائل کو کوئی صاحب غلط سمجھتے ہیں تو وہ ہمیں سمجھا دیں — ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر کسی صاحب نے دلائل سے ثابت کر دیا کہ اس 'گدھے' کا وہ مقام نہیں جو ہم نے سمجھا ہے بلکہ وہ مقام ہے جو ہمیں دلیل سے سمجھایا گیا ہے تو ہم اپنے نقطۂ نظر کو ترک کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کریں گے۔

اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی—ڈائیلاگ سید خالد جامعی ☆

مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی قابل ردّ ہے

مدیر البرہان اور محمد رشید صاحب کے الزامات غلط فہمی کا نتیجہ ہیں

ماہنامہ البرہان میں طویل عرصے سے سائنس کی حمایت ومخالفت میں تحریری مباحثہ جاری ہے۔ مدیر محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ،جن کے اخلاص، محبت اور دین کے لیے درد بے کراں کا میں عینی شاہد ہوں، اکتوبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں کسی غلط فہمی ،عجلت یا سہو کے باعث یہ تحریر فرمایا کہ سید خالد جامعی اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری وغیرہ **مغربی سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادے کو حرام سمجھتے ہیں اور جماعت الدعوۃ کے لوگ بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔**

ڈاکٹر صاحب کی راقم اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری کے بارے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں ہے۔ہم اس نقطۂ نظر کے قائل ہی نہیں جو ہمارے نام سے پیش کیا گیا ہے۔حلال وحرام کا فتویٰ دینے

کی ذمہ داری مفتی پر ہوتی ہے لہٰذا ہم سے منسوب یہ فتویٰ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ امت سائنس وٹیکنالوجی کا استعمال ترک کر دے۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ امت سائنس کی پوجا، پرستش اور قصیدہ خوانی کے بجائے اس کا تنقیدی جائزہ لے، اسے غیر اقداری نہ سمجھے کہ جدید سائنس اپنی اقدار رکھتی ہے۔ البرہان اکتوبر ۲۰۱۲ء کے شمارے کے سرورق پر ڈاکٹر صاحب نے سرخی لگائی ہے ''**مغرب کو ایک گولی چلائے بغیر فتح کیا جاسکتا ھے**''۔ کوئی نادان اصول استقراء کے تحت یہ استنباط کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر محمد امین جہاد کے دشمن اور مغرب کے ایجنٹ ہیں کیونکہ یہ جملہ اپنی کلیت سے الگ ہوکر اسی مفہوم کا حامل ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب جہاد کے دشمن ہیں تو پھر اس کا حامی کون ہے؟ ''البرہان'' میں جاری بحث عموماً اصول استقراء کے تحت ہورہی ہے لیکن استقراء یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔

مغربی تہذیب اور فلسفہ، فلسفۂ سائنس، جدید سائنس، ٹیکنو سائنس، سائنٹزم وغیرہ پر تنقید ہمارا خاص میدان ہے لیکن تنقید کو تکفیر سمجھنا درست رویہ نہیں۔ جدید سائنس بلکہ ٹیکنو سائنس پر تنقید کے سلسلے میں راقم تین ہزار صفحات تحریر کر چکا ہے جو محترم ڈاکٹر امین صاحب کی خدمت میں مطالعے کے لیے ارسال کیے جارہے ہیں۔ اس تحقیقی کام کی اشاعت میں کچھ وقت لگے گا۔ جو احباب اس تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کی خدمت میں ای میل کے ذریعے یہ لوازمہ ارسال کیا جاسکتا ہے۔

☆ ناظم شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

جدید سائنس پر تنقید ایک نہایت حساس، اہم، اور نازک موضوع ہے لہٰذا اس علمی موضوع پر بحث و مباحثے کے آداب وشرائط طے کرنا ضروری ہیں تاکہ بحث منطقی نتیجے تک پہنچے۔ ۲۰۱۱ء میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے راقم اور عبدالوہاب سوری صاحب کی سائنس سے متعلق ایک تقریر شائع کی تو البرہان کے رفیق کار جناب شاہد رشید صاحب نے اس پر ایک صفحے کی تنقید لکھی۔ ان کی تنقید میں صرف اعتراضات، شبہات اور سوالات تھے جو نہایت خلوص اور دردمندی کے جذبات پر مبنی تھے لیکن ان کا تنقیدی موقف علمی گہرائی سے محروم تھا لہٰذا اس ایک صفحے کے جواب میں راقم الحروف نے ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ایک مضمون البرہان کو ارسال کیا۔ یہ پہلی قسط تھی مقصد یہ تھا کہ اس علمی مباحثے کے بنیادی خدوخال اور اصول ومبادی ایک مرتبہ طے ہو جائیں تاکہ آئندہ گفتگو اور بحث مشترکہ منہاج میں ہو۔ مناظرے کا اصول یہی ہے کہ فریقین کسی اصول، منہاج اور پیمانے پر متفق ہوں اور مناظرہ اسی منہاج میں کیا جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مدیر محترم نے مباحثے کے بنیادی اصولوں سے متعلق ۲۶۵ صفحات میں سے صرف ۲۵ صفحات شائع کیے اور قارئین کو بغیر کسی اطلاع، وضاحت اور عذر کے مضمون کی اشاعت معطل کردی۔ مجھے فون پر انہوں نے اطلاع دی کہ مضمون بہت طویل ہے، رسالے کے صفحات اس طوالت کے متحمل نہیں ہوسکتے اگر اجازت ہو تو لاہور کے کسی ناشر سے اس کو کتابی شکل میں شائع کرانے کی بات کی جاسکتی ہے۔ گہرے علمی موضوعات نہایت

تدبر و تفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ مشکل مباحث پر اعتراضات کرنا اور سوالات اٹھانا نہایت آسان ہے لیکن کسی کے موقف کی گہرائی کو جاننے کے لیے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ طویل مضمون شائع ہو جاتا تو ڈاکٹر امین صاحب اور محترم محمد رشید صاحب میرے اور عبدالوہاب سوری صاحب کے نقطۂ نظر کے بارے میں بالکل غلط رائے اختیار نہ کرتے مگر مدیر محترم ڈاکٹر امین جو ہمارے بزرگ، نہایت مخلص اور اسلام کے لیے پارۂ سیماب ہستی ہیں، ان کی عدم توجہ اس بے بنیاد مباحثے کی بنیاد بن گئی جو البرہان میں اکتوبر ۲۰۱۲ء سے سائنس وٹیکنالوجی کے نام پر بغیر حوالوں [References] کے جاری وساری ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مباحثے کے ایک شریک نے سائنس کی ایسی تعریف بھی تحریر کی جس کو کوئی سائنس داں، کوئی فلسفی اور کوئی صحیح العقل فرد قبول نہیں کرسکتا لیکن ہمارے مدیر محترم کا وسیع ظرف اس غلط تعریف کی اشاعت میں مانع نہ ہوسکا۔ جو احباب سائنس کی درست تعریف بیان کرنے سے قاصر ہوں ان کے نقد پر کیا نقد کیا جائے؟۔ ڈاکٹر امین صاحب کی پیدا کردہ غلط فہمی کے باعث برادر مکرم و محترم محمد رشید صاحب نے راقم الحروف کے خلاف کئی صفحات پر مشتمل مضمون البرہان میں تحریر کردیا۔ مجھے ان کے اخلاص، دردمندی اور امت سے بے پناہ محبت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں۔ امت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر انہوں نے نہایت اخلاص لیکن نہایت بے بنیاد الزامات پر مشتمل آراء جو راقم الحروف کے بارے میں تحریر کی ہیں وہ صرف ان کی شاعرانہ خیال آرائی ہیں جن کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔ اپنے مضمون میں انہوں نے راقم پر جتنے الزامات لگائے ہیں وہ سب غلط در غلط بلکہ بالکل غلط ہیں۔ وہ اتہام و دشنام کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ پورے مضمون میں الزام لگاتے ہوئے راقم کی کسی ایک تحریر یا ایک جملے یا ایک مضمون کا دوسطری تو کیا یک سطری حوالہ بھی نہیں دیا گیا۔ غالباً محترم محمد رشید صاحب کی نظر سے راقم کی کوئی تحریر نہیں گزر سکی اور محترم نے محض سوئے ظن کی بنیاد پر افکار اور تنقید کی کہکشاں البرہان میں سجادی ہے۔ میں ان کے اخلاص اور امت سے بے پناہ محبت کے باعث ان کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحریر میں برکت عطا فرمائے، امت کے مقاصد کا دفاع کرنے کی صلاحیت میں مزید اضافہ فرمائے اور ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ ان کی تحریر کے ہر لفظ سے اختلاف کے باوجود ان کے بے پناہ خلوص نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔

مجھے اس بات پر بھی حیرت ہے کہ البرہان جو ایک علمی و تحقیقی رسالہ ہے اس میں راقم الحروف کے خلاف بغیر کسی حوالے کے تفصیلی مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ مدیر محترم کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی رسالے میں بغیر حوالوں کے تنقید شائع نہ کریں۔ بہرحال یہ سہو بھی خلوص نیت سے ہوا ہے لہٰذا مجھے اپنے برادر بزرگ ڈاکٹر محمد امین صاحب سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ صرف توقع ہے کہ وہ مستقبل میں کسی شخص کا تنقیدی خط یا تنقیدی مضمون شائع کرتے ہوئے اس میں حوالوں کا خاص اہتمام کریں ورنہ مضمون شائع نہ کریں تاکہ رسالے کا علمی معیار بلند ہوسکے۔

برادرم محمد رشید صاحب نے جو الزامات راقم پر عائد کیے ہیں اور سائنس وٹیکنالوجی کے حق میں جو کچھ دلائل دیے ہیں، وہ ان کے الفاظ میں درج کیے جارہے ہیں تاکہ ان کا حقیقی موقف اور اس موقف کی کمزوریاں انہی کے الفاظ میں واضح ہوجائیں:

- سائنس کے گدھے کا مقصد صرف انسان کی مادی خدمت ہے یعنی انسانی زندگی کو ضر رو عسر سے بچا کر فلاح و یسر کے لیے نوع بنوع ایجادات کی صورت میں انسانیت کے لیے خدمت گار مہیا کرنا۔
- ''اسلام کو بطور سوار اور سائنس کو بطور سواری کے گدھے'' استعمال کرنے میں امت کا اجتماعی مفاد ہے جب کہ خالد جامعی اس مفاد کا دشمن ہے۔
- جس طرح گدھے پر سوار ہونا کفر نہیں بالکل اسی طرح ''سائنس'' پر سوار ہونا بھی کفر نہیں ہے۔ مسلمان اس ''گدھے'' کو اپنے سروں اور کندھوں پر سوار کرنے سے انکار کردیں بلکہ مسلمان رہتے ہوئے، ایمان، اخلاق اور اسلامی اقدار سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے اس ''گدھے'' کی سواری کے خوب خوب مزے لیں کیونکہ دنیا کی نعمتوں کو وجود میں لانے کا اصل مقصود تو یہ تھا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار مستفید ہوں۔
- سائنس ایک گدھا ہے اس پر سواری کرنا مباح ہے۔ خالد جامعی نہ خود گدھے پر سواری کرتے ہیں نہ دوسرے کو سوار ہونے دیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اس گدھے پر کفر کا فتویٰ لگا کر اس کی نسل ہی کے خاتمے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم صرف سائنسی گدھے کی شرعی و عقلی تفہیم پیش کررہے ہیں اگر سائنسی گدھے کی تشریح میں ہمارے دلائل درست ہیں تو ہمارا مدعا حاصل ہوگیا۔
- خالد جامعی اور ان کے ہمنوا حضرات جدید دور کے ہر اُس محترم داعی، مفکر، عالم دین اور سلیم الفطرت ومتوازن الفکر قابل ذکر شخصیت مثلاً علامہ اقبال، مولانا مودودی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ڈاکٹر رفیع الدین وغیرہ کی تحقیر و تردید اور تمسخر اڑانا ضروری خیال کرتے ہیں جو سائنس کی حمایت کرتا ہے۔
- یہ مکتب فکر اپنی فکری بنیادوں کی تعمیر کے لیے مغربی فلاسفہ اور مغربی مفکرین کی تحریروں، کتابوں اور مقالوں کے اکثر و بیشتر محض ناموں کو سند اور برہان قاطع کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کتابیں اور مقالہ جات نہیں پڑھے ہم ان کے کسی سوال اور اعتراض کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس طرز عمل سے یہ حضرات اپنے نظریہ کی فکری بنیادوں اور اصل ماخذ و سرچشمہ کی نشاندہی کردیتے ہیں۔ قاری کو پکڑ کر مغربی فلاسفہ کی خدمت میں لے جاتے ہیں اور قاری سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی سائنس کی وہی تعریف درست مان لے جس کا اعلان و اظہار مغرب کے یہ حمقاء اپنی فاسد اور ایمان سے عاری سوچ کی بنیاد پر اور اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے کررہے ہیں۔ دوسرے

معنوں میں سائنس کی جو تعریف مغرب کے مفکرین نے کی ہے وہ درست نہیں ہے بالکل غلط ہے۔خالد جامعی صاحب بھی سائنس کی درست تعریف نہیں بتا رہے وہ مغربی مفکرین کی بیان کردہ سائنس کی تعریف کو درست سمجھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔

- اگر مغربی فلاسفہ سے یا ان کے کسی پیروکار سے ہمیں ہمکلام ہونا ہوتا تو ہم یقینا مغربی مفکرین کی کتب کا مطالعہ کرتے لیکن ہم تو جناب خالد جامعی سے مخاطب ہیں اور ان سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم صرف انہی کے افکار اور تحریروں کا مطالعہ کر لیں؟

- اور یا مقبول جان لکھتے ہیں کہ ''سائنس میں کوپرنیکس، نیوٹن اور ڈالٹن کے نظریات کو آئن سٹائن نے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا اور کہا کہ مغربی فلاسفہ سائنس کے نام پر تین سو سال تک جھوٹ پڑھاتے رہے ہیں''۔کیا ان فلاسفہ کے جھوٹ کو پڑھنا ضروری ہے؟

- سائنس دراصل ''عقل،علم اور مال و دولت'' ہی کی ایک جدید ترین شکل ہے۔جو مقام و مرتبہ قدیم دور میں ''عقل،علم اور مال و دولت'' کو حاصل ہوا کرتا تھا،جدید دور میں وہی مقام و مرتبہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی'' کو حاصل ہو گیا ہے۔

- اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہمیشہ ''عقل،علم اور مال و دولت''،یعنی مادی و سائنسی ٹیکنالوجی کی طاقت کے لحاظ سے اپنے عہد کی قوموں کے مقابلہ میں غیر معمولی حد تک کمزور اور کمتر ہونے کے باوجود اپنے دین کو غالب کرتا رہا ہے۔شاید آخری دور میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ دین اسلام کو اپنی اسی سنت کے مطابق پوری دنیا پر غالب کر کے دکھائیں گے۔انبیاء ہمیشہ سائنس و ٹیکنالوجی میں غیر معمولی حد تک کمزور اور کمتر رہے۔مگر یہ حکمت و مشیت ربانی اور ارادۂ الٰہی کا معاملہ ہے نہ کہ شریعت کا۔لہٰذا وہ نہایت کم مادی وسائل کے حامل اپنے سچے ماننے والوں سے کافروں کو بے حد زیادہ طاقت ور ہونے کے باوجود عبرتناک شکست سے دو چار کرتا رہا ہے۔اللہ کی یہ سنت اور مشیت صرف انبیاء کے ساتھ تھی،شریعت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اچھی طرح سائنس و ٹیکنالوجی حاصل کریں۔

- اللہ تعالیٰ نے عقل،علم ، مال، دولت یعنی سائنس و ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے، اسے محرومین و مستحقین میں بانٹنے اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے کام کو ایک بڑی نیکی،عبادت اور فریضہ قرار دیا ہے۔

- سائنس کو مغرب والوں نے اغواء کر لیا ہے۔سائنس کا گدھا مغرب کا مغوی ہے۔مغرب میں شیطان نے سائنس کے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس میں کامیاب رہا۔لہٰذا مغرب نے سائنس کو مغوی بنا رکھا ہے۔خالد جامعی سائنس کو مذہب دشمن اور کفر والحاد قرار دے کر ایک مہلک

بیماری (دنیا پرستی) کا جو علاج تجویز کر رہا ہے وہ ایک اور مہلک بیماری (رہبانیت) کو جنم دینے کا باعث بن رہا ہے۔

- انسانی مسائل کے حل کے لیے وقوع پذیر ہونے والی ''سوچ و کاوش'' سائنس کہلاتی ہے۔ انسانی 'سوچ و کاوش' یا 'عقل+علم+دولت' عصر حاضر کی زبان میں سائنس و ٹیکنالوجی کہلاتی ہے۔
- عین عروج کے زمانے میں مسلمان انسانی سوچ و کاوش یعنی سائنس کی روحانی رہنمائی سے الگ ہو گئے۔ یہی ان کا اصل المیہ ہے۔
- مسلمانوں کے زوال کا سبب سائنس و ٹیکنالوجی سے غفلت اور عیش میں مبتلا ہونا ہے۔
- طبعاً و عقلاً مغرب اسلام کے بے حد قریب آ گیا ہے۔ مسیحیت نے سائنس کو قائدانہ کردار دیا ہم بھی اسے یہی کردار دیں تا کہ مغرب اسلام کی گود میں آ جائے۔ لبرل ازم اور سائنٹسزم فرسودہ مذاہب ہیں مغرب کے لوگ ان کو چھوڑ کر مذہب کی آغوش میں آنا چاہتے ہیں۔ خالد جامعی اس خیر کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر رہا ہے اور سائنس کی مخالفت کر کے مغرب کے کفار کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔
- ٹیکنالوجی اس وقت قوت و سطوت کا مظہر اور وسیلہ ہے۔ اسی وجہ سے مغرب نہیں چاہتا کہ مسلم ممالک اس ٹیکنالوجی خصوصاً اعلی حربی ٹیکنالوجی کے حامل ہو جائیں۔ خالد جامعی مغرب کی اس سازش میں شریک ہے، وہ سائنس کو کافر کہہ کر لوگوں کو روک رہا ہے۔
- شریعت چیزوں، سائنسی استعمالات اور آلات و وسائل کے بارے میں قطعاً کفر کا کوئی حکم نہیں لگاتی لہٰذا سائنس تو کافر ہو ہی نہیں سکتی۔ حکم انسان پر لگتا ہے اشیاء پر نہیں۔ کافر انسان جب مسلمان ہو سکتا ہے تو کافر سائنسی ایجاد کیوں مسلمان نہیں ہو سکتی؟ ایک یہودی کافر ذمی سے خدمت لی جا سکتی ہے اسے مسلمان بنایا جا سکتا ہے تو ایک کافر ایجاد سے خدمت کیوں نہیں لی جا سکتی اسے مسلمان کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ زندہ کافر کو مسلمان بنانے سے زیادہ آسان، بلکہ بہت آسان سائنس کی کافر ایجاد کو مسلمان بنانا ہے۔ کافر کو مسلمان بنا سکتے ہیں تو کافر آلے سائنس کو مسلمان کیوں نہیں بنا سکتے؟
- علوم عقلیہ کے سائنسی سیکولر اداروں سے ہی دین کے سچے مخلص انقلابی سپاہی اور انقلابی قیادت ابھر رہی ہے جبکہ علوم نقلیہ کے دینی مدرسوں سے سیکولر اسلام دشمن لوگوں کی فوج اور قیادت ابھر رہی ہے جیسے سرسید، غلام احمد قادیانی، احمد رضا بریلوی وغیرہ۔ سائنسی تعلیم کے ادارے اب درس قرآن کے نور سے جگمگا رہے ہیں جبکہ دینی اداروں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔

- خود سائنس اپنے ماننے والوں کو وحی کے ماننے پر اکساتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس خود اللہ کی ربوبیت پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔
- سائنس مخالف مکتبِ فکر کے موجودہ فکری قائد جناب خالد جامعی کی چند تفصیلی تحریریں ہمارے ہاتھ لگیں اور ہم نے پورے خلوص نیت اور دلچسپی سے اس نکتہ نظر کو اس کے استدلالات و بنیادوں سمیت سمجھنے کی کوشش کی۔ سابقہ سطور میں ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف ایک منفرد اور بظاہر اچھوتے دعویٰ (مفروضہ) کی جانچ اور تنقیح ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی حرام ہیں، امت اس کا استعمال ترک کردے۔

راقم الحروف مندرجہ بالا تمام الزامات کی تردید کرتا ہے۔

البرہان:

محترم خالد جامعی صاحب نے جس طرح مختصر انداز میں خود سے منسوب سائنس وٹیکنالوجی کے حوالے سے نقطۂ نظر کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان کا مؤقف نہیں ہے اسی طرح اگر وہ تین چار صفحات میں مختصراً یہ بھی بتادیں کہ سائنس وٹیکنالوجی کے بارے میں اثباتاً ان کا مؤقف کیا ہے تو یہ قارئین البرہان پر ایک احسان ہوگا اور ان کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا آسان ہوجائے گا۔

ملی مجلس شرعی کی قراردادیں

اہل تشیع کی ٹارگٹ کلنگ کی مذمت

مؤرخہ ۱۲ جنوری ۲۰۱۳ء کو ملی مجلس شرعی کی مجلس منتظمہ کے ایک اجلاس میں، جس میں اہل سنت کے سارے مسالک کے ثقہ علماء موجود تھے، علماء کرام نے کوئٹہ میں اہل تشیع کی ٹارگٹ کلنگ کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے اسے ظلم و بربریت سے تعبیر کرتے ہوئے حملہ آور دہشت گردوں کے خلاف حکومت سے سخت ایکشن لینے کا مطالبہ کیا تاکہ ظالم اپنے انجام کو پہنچ سکیں۔

ارکان مجلس نے اہل تشیع کے علماء کو اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اہل تشیع کے خلاف علمی اور عوامی سطح پر ہرگز اشتعال کی فضا موجود نہیں ہے اور نہ اس طرح کے بہیمانہ واقعات کی وجہ مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلاف ہے۔ علماء کرام نے کہا کہ ان واقعات کے پیچھے اسلام اور پاکستان دشمن بیرونی قوتوں کا ہاتھ ہے جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان فرقہ وارانہ آگ بھڑکا کر پاکستان کو

کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ملی مجلس شرعی کے علماء کرام نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بیرونی ایجنسیوں اور ان کی سازشوں کا قلع قمع کرے جو اس طرح کے واقعات سے خلفشار پیدا کر کے پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔

قاضی حسین احمد کی وفات سے ملی یک جہتی کو نقصان پہنچا

ملی مجلس شرعی کی منتظمہ کے ایک اجلاس میں، جس میں سارے دینی مسالک کے علماء کرام شامل تھے، شرکاء نے قاضی حسین احمد صدر ملی یک جہتی کونسل کی اچانک وفات کو ایک دینی اور قومی نقصان قرار دیا۔

علماء کرام نے کہا کہ قاضی حسین احمد مرحوم نہ صرف ایک مدبر سیاست دان تھے جنہوں نے ہمیشہ اسلامی اقدار کی بلندی کے لیے جدوجہد کی بلکہ دینی جماعتوں اور علماء کرام کے درمیان اتحاد واخوت کو پروان چڑھانا ان کا خصوصی مشن تھا۔وہ پہلے بھی ملی یک جہتی کونسل کے پلیٹ فارم سے فرقہ واریت کم کرنے اور دینی سیاسی جماعتوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور اب بھی وہ اپنی بھرپور توانائیاں علماء کرام اور دینی جماعتوں کے درمیان اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے صَرف کر رہے تھے۔

ملی مجلس شرعی کے علماء کرام نے جماعت اسلامی اور ملی یک جہتی کونسل کے رہنماؤں سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مرحوم کو ان کی نیکیوں کے طفیل جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی خامیوں سے درگزر فرمائے اور امت مسلمہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین، یا رب العالمین۔

داڑھی سے متعلق جامعہ ازہر کا فتویٰ غلط ہے

ملی مجلس شرعی کے علماء کرام نے، جس میں سارے دینی مسالک کے علماء کرام شامل ہیں، جامعہ ازہر مصر کے اس فتوی کی تردید کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ داڑھی رکھنے نہ رکھنے کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علماء کرام نے کہا جب ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مستند فرمان موجود ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ تو پھر جامعہ ازہر کے علماء کا داڑھی رکھنے نہ رکھنے کو مقامی عادت وفیشن قرار دینا اور اسے شرعی حکم سے مستثنیٰ قرار دینا محض اسلام مخالف مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت اور تجدد کی راہ کو اپنانا ہے۔

ملی مجلس شرعی کے علماء کرام نے کہا کہ داڑھی رکھنا صحیح احادیث اور امت کے چودہ سو سالہ تعامل کی وجہ سے ایک دینی شعار بن چکا ہے اور اس پر عمل کرنا سنت ہے جس کا تارک گنہگار ہے۔ لہٰذا مصر، ترکی، ایران اور بعض دوسرے مسلم ممالک میں علماء کرام کا داڑھی نہ رکھنا اور داڑھی نہ رکھنے کا فتویٰ دینا غلط ہے۔ یہ شریعت کی غلط تعبیر ہے اور شرعی لحاظ سے قابل رد ہے۔

جرمنی میں قادیانیوں کی کامیابی

ملی مجلس شرعی کی منتظمہ کے ایک اجلاس میں، جس میں سارے دینی مسالک کے علماء کرام موجود تھے، شرکاء نے ایک یاداشت جرمن سفیر متعین اسلام آباد کو بھجوانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اپنی حکومت کے علم میں لائیں کہ قادیانی نہ تو مسلمان ہیں اور نہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

علماء کرام نے ایک مقامی روزنامہ میں چھپنی والی اس رپورٹ پر تشویش کا اظہار کیا جس کی بدولت جرمنی کی ریاست ہیسن (Hessen) کے سکولوں میں مسلمان بچوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے قادیانیوں (اور ایک ترک تنظیم) کا مسودہ منظور کرلیا گیا ہے جب کہ مسلم تنظیمیں باہم مسلکی اختلافات کی وجہ سے کوئی متفقہ مسودہ تیار نہ کرسکیں۔

ملی مجلس شرعی کے علماء کرام نے جرمنی کی دینی تنظیموں پر زور دیا ہے کہ وہ مسلکی اختلافات سے درگزر کرتے ہوئے اسلام کے وسیع تر مفاد میں متحد ہو جائیں اور اہل سنت کے مجمع علیہ عقائد و تعلیمات کو بنیاد بناتے ہوئے ایک متفقہ نصاب بنا کر جرمن ریاست کی حکومت کو دیں کیونکہ ان کے درمیان فکری انتشار اور نااتفاقی کی وجہ سے قادیانیوں کو آگے آنے کا موقع ملا ہے۔

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش

۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال واخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز
۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی
۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی
۲۳۔ السلطة التشريعية۔ دراسة مقارنة